قائدِ اعظمؒ سے بینظیر بھٹو تک

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی
یادوں کے آئینے میں

مرتب: تنویر ظہور

Ebook By
Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

پاکستان کی سیاسی صورتحالی کا مطالعہ۔۱۹۹۳ء تک

سنِ اشاعت : ——— نومبر ۱۹۹۳ء
قیمت : ——— روپے
مقامِ اشاعت : ——— فضل حق اینڈ سنز
پبلشرز اینڈ پرنٹرز،
دربار مارکیٹ لاہور۔

انتساب

قائداعظمؒ

اور

علامہ اقبالؒ کے نام

ترتیب

پیش لفظ

کچھ عرصہ پہلے روزنامہ "جنگ" لاہور کے سب ایڈیٹر تنویر ظہور نے مجھ سے رابطہ کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کے اخبار کے لیے اپنی یادداشتیں قلم بند کروں۔ اگرچہ ان کا یہ خیال نیک نیتی پر مبنی تھا لیکن میری مصروفیات آڑے آئیں اور میں نے معذرت کر لی، کیونکہ میرے لیے طویل یادداشتوں کو قلمبند کرنا آسان نہ تھا۔ علاوہ اس کے میری اپنی نگاہ میں ان یادداشتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میری زندگی اس کوشش میں گزری کہ میری قوم اور ملک کے حالات بہتر ہو جائیں گے لیکن بار بار مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ پھر بھی مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں زندگی گزارنا ایک طرح سے پیدا ہو کر موت کا انتظار کرنا ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی بہتری کے لیے پیہم جدوجہد کی صورت ہی میں گزرنی چاہیئے میں نہیں سمجھتا کہ میری یادداشتوں سے کوئی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے ویسے بھی ہم من حیث القوم کسی بات سے سبق یا عبرت حاصل کرنے کے خلاف ہیں۔

بہرحال تنویر ظہور صاحب نے اس کا یہ حل تجویز کیا کہ میں بولتا جاؤں اور وہ نوٹس لیتے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ اپنا ٹیپ ریکارڈ لے کر آجاتے اور مجھ سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتے رہتے اور میں ان کے جوابات ریکارڈ کرواتا رہتا، یوں میری یادداشتوں کی پہلی قسط روزنامہ "جنگ" میں طبع ہوئی تو احباب نے بالخصوص اور قارئین نے بالعموم اسے بے حد سراہا۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا اور چھ اقساط میں، میں نے مختصراً اپنی ان یادداشتوں کو جمع کیا جو علامہ اقبال، پاکستان اور پاکستان کی بعض اہم سیاسی شخصیات کے حوالے سے مرتب ہوئیں۔ اگرچہ میری دانست میں یہ کام ختم ہو چکا تھا لیکن تنویر ظہور کے ذہن میں مزید سوالات بھی تھے چنانچہ ان کے جوابات کے لیے بھاری اور نشستیں ہوئیں۔ وہ جوابات "جنگ" میں تو شائع نہ ہوئے لیکن اس کتاب کا حصہ ہیں۔ وہ کام جو محض صحافتی ضروریات کے تحت کیا گیا تھا تکمیل پا کر اچھی خاصی کتاب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

میرے ذہن میں ان یادداشتوں کو کتابی صورت میں شائع کرانے کا کوئی منصوبہ نہ تھا لیکن تنویر ظہور صاحب نے یہ کام بھی کر دکھایا اور اب یہ کتاب "یادیں" کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ محض یادداشتیں ہی ہیں اس لیے ان میں مواد کی ترتیب اور پیش کش میں وہ ترتیب اور نظم و ضبط نہیں مل سکتا جو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت قلم بند کی گئی خود نوشت سوانح عمری میں ملتا ہے۔ کیونکہ یہ یادداشتیں بول کر لکھوائی گئیں اس لیے اس میں حافظے کے تسامح کی بنا پر کچھ تاریخوں میں غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے جس کے لیے پیشگی معذرت۔ اور آخر میں، میں تنویر ظہور صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کی توجہ اور محنت سے پہلے یہ یادداشتیں "ضبط تقریر" میں لائی گئیں اور پھر انہوں نے کتابی روپ اختیار کیا۔

جاوید اقبال
18۔ ستمبر 90ء

دیباچہ

اگرچہ بڑا درخت گھنا اور سایہ دار ہوتا ہے لیکن اس کے سائے میں کسی اور درخت کا پھلنا پھولنا محال ہوتا ہے وہاں کومل بیلیں اس کا سہارا لے کر بلندی سے سرفراز ہو سکتی ہیں یا پھر سبزہ کے قدموں میں سبز قالین بچھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی عالم علامہ اقبال کا ہے شاعری ہو یا ملی نشاۃ الثانیہ اسلام میں تجدید پسندی ہو یا سیاسی مستقبل بینی وہ ہر لحاظ سے ایسے سربفلک شجر اور اپنے وجود میں گھنے سائے کے حامل تھے کہ آج بھی ہم پر سایہ فگن ہیں۔ ان سے بڑھ کر نظم گو نہ پیدا ہوا، ان سے بڑھ کر سیاسی مفکر ہمیں نہ ملا تو اسی باعث کہ وہ شعر اور فکر کو ان بلندیوں تک لے گئے کہ آنے والے شعرا اور مفکرین کے لیے وہاں تک پہنچنا آسان نہ تھا یہی وجہ ہے کہ ہمیں علامہ اقبال کے ناقدین کے برعکس شارحین ملتے ہیں ان کی فکر کی حرارت اور قلب کی تپش سے آشنا تو کم ہونگے لیکن ان کے مجاوروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے جب ہوش سنبھالا اور خود کو فرزند اقبال کے طور پر معروف پایا ہوگا تو انہوں نے یقیناً خود کو بھی اس بیل جیسا ہی پایا ہوگا جو شجرِ اقبال سے پیوست ہو اور جس میں اپنی قوت نمو کا فقدان ہو۔ ایک ذہین حساس اور ذاتی ترجیح رکھنے والے نوجوان کے لیے ایسی صورت حال ذہنی الجھن کا موجب بن سکتی تھی ہو سکتا ہے عمر کے ابتدائی حصے اور نوجوانی میں جاوید اقبال کے لیے ان کے والد محترم نے ایک کمپلیکس کی صورت اختیار کر لی ہو۔ میرے اس قیاس کو اس امر سے کسی حد تک تقویت ملتی ہے کہ وہ جوانی میں مصوری، سنگتراشی اداکاری اور ڈرامہ نگاری کی طرف مائل تھے واضح رہے کہ علامہ اقبال نے ان سب کو پسند نہیں کیا۔ میں اس موقع پر علامہ اقبال کے فنون لطیفہ کے بارے میں خیالات کا تجزیاتی مطالعہ نہیں کرنا چاہتا لیکن انہوں نے جہاں کہیں بھی ان موضوعات پر لکھا تو طاؤس و رباب کو "آخر" ہی قرار دیا جبکہ نوجوان طالب علم جاوید اقبال صاحب کے مسلک میں یہ "اول" نظر آتے ہیں۔

یقیناً اس عہد کے جاوید اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ایڈیپس صورتحال کے لحاظ سے بے حد دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے لیکن میں اتنے گہرے پانیوں میں اُترنے کو تیار نہیں۔ غالباً خود جاوید اقبال صاحب کے تحت الشعور میں بھی یہ بات ہو گی کیونکہ انہوں نے ایک موقع پر یہ کہا ہے کہ "علماء مجھے حضرت نوحؑ کے نافرمان بیٹے سے تشبیہ دیتے تھے" گویا وہ کسی نہ کسی طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ میں باپ کے فکری نقش قدم پر نہیں چل رہا۔

تنویر ظہور کی مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی یادداشتیں اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں کہ یہ انٹرویو کی صورت میں مدون کی گئیں۔ تنویر ظہور سوال کرتا اور ڈاکٹر جاوید صاحب ٹیپ ریکارڈر میں جواب بولتے جاتے تھے یوں دیکھیں تو یہ تمام کتاب تحریر کے بجائے تقریر ہے۔ اب اگر اس میں لذت تقریر بھی پیدا ہو گئی تو یہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے اسلوب کا کمال ہے۔

میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے حلقۂ احباب میں شامل نہیں ان سے صرف چند ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن میں نے پہلی ملاقات میں ان کے مزاج کی یہ خاصیت بطور خاص نوٹ کی کہ وہ جس موضوع پر بھی لب کشا ہوئے، لگی لپٹی رکھے بغیر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ ملکی سیاست ہو یا مذہبی قیادت، ملائیت ہو یا آمریت حتیٰ کہ خود ان کے والد محترم ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر انہیں کسی معاملے میں اختلاف ہے تو وہ بلا جھجک اس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ خاصیت ان کی تقاریر میں بھی ملتی ہے اور مضامین میں بھی، اور اسی خاصیت کی بنا پر ایک کامیاب جج بھی ثابت ہوئے اور یہی خاصیت تنویر ظہور کو ریکارڈ کرائی گئی ان یادداشتوں میں بھی نمایاں تر نظر آتی ہے۔ تنویر ظہور نے بعض حساس مسائل پر چبھتے ہوئے سوالات کئے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے کسی طرح کا جواب دیتے ہوئے بھی اگر مگر والی بات نہیں کی بلکہ ہمیشہ دو ٹوک الفاظ میں اپنا مؤقف پیش کیا۔ لہٰذا اس کتاب کی روشنی میں انہیں "گفتار کا غازی" قرار دیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاصیت شروع سے ہی ان کے مزاج کا حصہ رہی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انگلستان میں ان کے دو اساتذہ تھے۔ یہودی پروفیسر روبن لیوی اور کٹر عیسائی پروفیسر آربری۔ ان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "تعظیم میں اپنے ان دونوں اساتذہ کی کرتا رہا لیکن میں ان دونوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوا"۔ اس کی وجہ بھی ڈاکٹر جاوید

اقبال صاحب نے بتائی ہے کہ "بابر ان کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ اسلام دوست ہیں، میں نے چونکہ ان کے ساتھ کام کیا تھا اس لیے میں جانتا تھا کہ ان کے ہاں ایک خاص تعصب جو یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں اسلام کے خلاف ہوتا ہے وہ موجود تھا، اس کا اظہار خواہ وہ کتابوں میں نہ کریں لیکن کہیں نہ کہیں ہو جاتا تھا"۔

اسی طرح انہوں نے علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال شناسوں کے لیے آرنلڈ اور آربری نے بہت اہمیت حاصل کر رکھی ہے جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کی روشنی میں یہ حضرات "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کا منظر پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے یہ لکھا ہے۔

"شروع شروع میں مذہب سے متعلق میرے خیالات میں انتشار تھا" یہ اعتراف بہت معنی خیز ہے اس لیے کہ ہر وہ ذہین، حساس اور سوچنے والا شخص طالب علمی یا نوجوانی کے زمانے میں اس طرح کے انتشارِ فکر کا شکار رہتا ہے بالخصوص اگر اس نے سائنس یا فلسفے کا مطالعہ کیا ہو۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ انہیں مسلمان بچوں کی روایت کے عین مطابق حساب نہیں آتا تھا لیکن انہیں سائنس سے بہت دلچسپی تھی اور وہ امتحان میں اول آیا کرتے تھے۔ اب آپ تصور کریں اس نوجوان کا جو سائنس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے بعد فلسفے کا تو یقیناً مذہبی عقائد اور اس سے جنم لینے والے اخلاقی مسلمات اور ٹیبوز کے بارے میں عقائد کا متزلزل ہو جانا یا تشکیک کا پیدا ہونا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال بھی تشکیک کی منزل سے گزر گئے۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ تو خود گھر میں ہی علامہ اقبال کے افکار کی صورت میں موجود تھی لیکن ایک اور عمومی وجہ بھی ہے اور یہ فکری ہے مگر اس کا راستہ خاصا پیچیدہ اور دشوار گزار ہوتا ہے یعنی سائنس اور فلسفہ کا ابتدائی اور سطحی مطالعہ پہلے تشکیک پیدا کرتا ہے لیکن اگر یہی مطالعہ مزید گہرائی میں جا کر کیا جائے تو وہ شکوک کے کانٹوں کو یقین کے پھولوں میں تبدیل بھی کر دیتا ہے اور غالباً یہی ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بھی ہوا ہو گا لیکن ان کا یہ اعتراف بذات خود اہم ہے اس بنا پر کہ خود ایک زمانے میں علامہ اقبال بھی اس وادیٔ پُرخار سے گزر چکے تھے۔

پاکستان کی تباہی اور بربادی میں بالعموم تین عوامل سرگرم نظر آئے ہیں۔

سیاست دان، بیوروکریسی اور مُلاّ- خود علامہ اقبال مذہبی مفکر ہونے کے باوجود بھی ملائیت کے شدید مخالف تھے اور انہوں نے نہ صرف اپنے اشعار میں ملاّ کو ہدف ملامت بنایا بلکہ اسے "کرگس" سے تشبیہ بھی دی- خود مُلاّ بھی ساری عمر علامہ اقبال کے خلاف رہا حتیٰ کہ کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا گیا- ڈاکٹر جاوید اقبال کی یادداشتوں میں سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ مُلاّ کے بارے میں بھی کھُل کر اظہار خیال کیا گیا ہے- مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ احراری علماء میرے خلاف تقریریں کرتے تھے اور "جو علامہ اقبال مسجد تھی اس مسجد کی تعمیر دوبارہ کرا کے ہم نے مسجد کو اوپر کی منزل پر کر دیا تھا اور نیچے دکانیں بنا دی تھیں تاکہ ان دکانوں کی آمدنی سے مسجد کا خرچ چلے اور خیرات پر نہ چلے، ان علماء کے نزدیک میرا یہ قدم درست نہ تھا اس لئے مجھے (نوح کا) نافرمان بیٹا کہا گیا"-

اس نوعیت کے اور بھی مقامات آئے ہیں جہاں انہوں نے مُلاّ اور نام نہاد علماء کے بارے میں اپنے خیالات کو بلا جھجک پیش کیا ہے- اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں "جب علامہ اقبال علماء کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو وہ انہیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ علامہ اقبال جیسا قدامت پسند اور کوئی نہیں کسی زمانے میں ایسے ہی علماء علامہ اقبال پر کفر کے فتوے بھی لگاتے تھے اب علماء کا کوئی بھی خطبہ منبر پر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک علامہ اقبال کے شعروں کا حوالہ نہ دیں"-

آج کل سیاست کی گرم بازاری ہے کہ شیر آیا شیر آیا کی مانند الیکشن آیا الیکشن آیا، کہا جا رہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ ماحول میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی "یادیں" کا وہ حصہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس میں انہوں نے مختلف سیاسی شخصیتوں اور عسکری آمروں کا تذکرہ کیا ہے- تنویر ظہور نے بھی کرید کرید کر سیاسی حوالے برآمد کرائے ہیں- فرزند اقبال ہونے کی بنا پر ڈاکٹر جاوید اقبال کا کسی نہ کسی سطح پر حکومت اور حکمرانوں سے رابطہ رہا ان کی یہ خوبی ہے، انہوں نے کسی بھی حکمران سے ناجائز مراعات نہ حاصل کیں ورنہ آج احتساب کے عمل سے گزر رہے ہوتے- آج باضمیر ہونے کی بنا پر سب کے بارے میں حرفِ حق ادا کر سکتے ہیں- وہ اس معاملے میں کتنے بااصول تھے اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب انہیں کمیشن برائے اسلامی قوانین کے ساتھ منسلک کیا گیا تو سکندر مرزا نے ہنس کر

کہا تھا "کمشن تو محض دکھاوے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے- اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں کیونکہ دراصل کمشن نے نہ تو کوئی کام کرنا ہے، نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے"- جب ڈاکٹر جاوید اقبال ایسے ناکارہ کمشن کے رکن بن گئے تو انہوں نے اس بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا کہ جب کوئی کام نہیں کیا تو پھر معاوضہ کس بات کا- یہ بڑے ظرف کی بات ہے اسی مثال سے ہمارے ہاں وقتاً فوقتاً جو کمشن بنتے رہتے ہیں ان کی "حسنِ کارکردگی" اور ان کمشنوں سے منسلک حضرات کی خدمت اور معاوضے کے باہمی تعلق کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے- اپنے اس رویے کی ڈاکٹر جاوید اقبال نے یوں وضاحت کی ہے "ضمیر فروشی کا معاملہ آیا ہے تو علامہ کے ارشادات اچانک مجھے زنجیروں کی طرح جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بعض سے میں وقتی طور پر متاثر بھی ہوا ہوں یا توقعات بھی وابستہ کی ہیں لیکن ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر نہیں لیکن صرف اس امید سے کہ شاید ان کے ہاتھوں ملک میں ایک صالح سیاسی نظام کا نفاذ ہو سکے جس سے ملک کی فلاح و بہبود کے امکانات پیدا ہو جائیں مگر ان کی ذات میں جن صفات کے دیکھنے کی آرزو کرتا رہا وہ نظر نہ آئیں اور مجھے بامر مجبوری یہ کہہ کر کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی-

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے نور گفتار واہی

سیاست کے ضمن میں اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں لیکن صدر ایوب نے سیاست دانوں کے بارے میں جو کہا اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں ایک تو یہ کہ صدر ایوب کس قسم کے سیاست دانوں کو پسند کرتا تھا اور دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں عمومی طور پر سیاست دان ہوتے ہی ایسے ہیں جیسے کہ بقول صدر ایوب "ہم تو مکاروں (راسکلز) کی تلاش میں ہیں، تم تو ماشاءاللہ راست باز (اپ رائٹ) قسم کے شخص ہو، تمہیں وزیر کون لے سکتا ہے- اس سے میرا دل پژمردہ ہوا- میں نے ایوب خان کو جواب دیا کہ ہماری حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم کتنے مکار ہیں"

ڈاکٹر جاوید اقبال کی ان یادداشتوں میں بھٹو اور اس کے مقدمے کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے وہ جن نامور ججوں کے ساتھ متعلق رہے ان کا بھی ذکر کیا گیا

ہے۔ انہوں نے بحیثیت جج اپنے طریق کار پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ اپنے بچپن، تعلیم، شادی، چودھری محمد حسین، بیرونی کانفرنسوں اور خطبات وغیرہ کا بھی احوال سنایا ہے۔ الغرض یہ "گفتاری کتاب" ان تمام خصوصیات، معلومات اور کوائف کی حامل ہے جو ایک اچھی سوانح عمری میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اس اہم کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہمیں ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ ساتھ تنویر ظہور کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئیے کہ بولنے اور سننے والے کے اشتراک سے ایک دلچسپ کتاب معرض وجود میں آ گئی۔

ڈاکٹر سلیم اختر
شعبہ اردو:
گورنمنٹ کالج لاہور۔
لاہور: 14۔ ستمبر 1990ء

میرا بچپن

میری پیدائش 5۔اکتوبر 1924ء میں ہوئی۔ اس دور میں بہت کچھ ہوا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ترکی نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے دنیائے اسلام کی جو مرکزی پوزیشن بحیثیت سلطنت کے تھی اسکا خاتمہ ہو گیا نتیجے میں مسلم قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ایک تو یہ اہم بات تھی اس دور کی دوسری یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمانوں اور ہندوؤں کا اتحاد خلافت کی تحریک کے سلسلے میں ہوا تھا وہ ختم ہو گیا اور مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ دوسری اہم بات تھی۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کا احیاء قائداعظم محمد علی جناح نے اسی دور میں دوبارہ کیا۔ اس دور کی مزید اہمیت یہ ہے کہ اسی عرصے میں لیگ کے لیڈروں میں اختلاف پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں 27ء میں مسلم لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ایک جناح لیگ کہلائی اور دوسری شفیع لیگ کہلائی علامہ اقبال شفیع لیگ کے ساتھ منسلک تھے۔ علامہ صاحب شفیع لیگ کے سیکرٹری جنرل مقرر کئے گئے۔ انہوں نے اپنی میٹنگ لاہور میں کی جبکہ جناح لیگ کی میٹنگ کلکتہ میں ہوئی۔ اختلاف کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جداگانہ طریق انتخاب کو چھوڑا جائے یا نہ چھوڑا جائے لیگ کے دو ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے جناح لیگ کی یہ کوشش جاری رہی کہ نہرو کمیٹی مسلمانوں کے مطالبات مان لے لیکن نہرو کمیٹی نے جو اپنی رپورٹ پیش کی اس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا کوئی مطالبہ منظور نہ کیا یہ دور ہے جس میں پہلے تو دس نکات بنے جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے بنائے اور اس میں قائداعظم نے مزید چار کا اضافہ کیا لہٰذا قائداعظم کے چودہ نکات کے طور پر معروف ہوئے۔ اسی دور میں علامہ اقبال نے الہ آباد خطبہ دیا کہ جو شمالی مغربی حصے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے ان کی الگ ریاست بنا دی جائے سب سے اہم بات اس دور کی یہ بھی ہے کہ مدراس میں علامہ اقبال نے اپنے چھ لیکچر دئیے۔ 1924ء میں علامہ اقبال نے اجتہاد پر خطبہ دیا

جس پر بعض اصحاب نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ کیونکہ انھوں نے جو خیالات پیش کئے تھے وہ فقہ کی تمدین نو کے متعلق تھے یہ خطبے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اسی دور میں گول میز کانفرنسیں ہوئیں ان میں بھی مسلمانوں کے فائدے کے لیے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اسی دور میں یعنی 1935ء کے بعد علامہ نے احمدیت کی تحریک کی شدید مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ انہیں اقلیت قرار دیا جائے۔ اس سے پہلے انھوں نے اس قسم کا انداز اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ احمدیت پر اسلیے معترض تھے کہ وہ ختم نبوت تسلیم نہیں کرتے تھے مزید برآں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت کا حساب اس طرح تھا جیسے 49 اور 51 کا علامہ کو یہ خدشہ تھا کہ اگر احمدیت کو فروغ حاصل ہوا تو یہ مسلمانوں کے ساتھ تو ہے نہیں اگر یہ یونی نسٹ کے ساتھ مل گئے جیسے کہ یہاں فضل حسین کی کوشش تھی تو نتیجہ یہ ہو جائے گا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتے ہوئے بھی مسلمان اقلیت میں ہو جائیں اس وجہ سے علامہ نے اسکا بار بار اعلان کیا اور بیان دیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ ان کو مسلمان نہ سمجھا جائے۔ یہ اس دور کی اہم باتیں تھیں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے یہ وہ دور تھا جو حضرت علامہ کے ساتھ گزرا علامہ کی وفات کے وقت میری عمر ساڑھے تیرہ برس تھی۔ میں نے انہیں مختلف کیفیات میں دیکھا ہے۔ میری زندگی کے پہلے پانچ یا چھ برس تو نکال دیں مجھے جو ان کے متعلق ہوش ہے وہ 1930ء کے بعد کا دور ہے 1931ء میں علامہ پہلی بار گول میز کانفرنس کے لیے انگلستان گئے۔ اس دوران میں نے انہیں ایک خط لکھا تھا جس میں مطالبہ کیا تھا کہ جب واپس آئیں تو میرے لیے گراموفون باجہ لیتے آئیں جس کے جواب میں انھوں نے یہ نظم لکھ کر بھیجی۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
میرے ثمر سے مئے لالہ وفام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اسکا محرک یہی تھا کہ میں نے گراموفون باجے کا مطالبہ کیا

اور انہوں نے جواب میں کہا۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یعنی ان کے نزدیک وہاں سے باجہ منگوانا شیشہ گران فرنگ کا احسان اٹھانا تھا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر بہرحال وہ باجہ نہ آیا۔ پھر میں نے علامہ صاحب کو مختلف شخصیات کی معیت میں بھی دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ 1930ء یا اس سے پہلے مولانا محمد علی جوہر ہمارے گھر میں آکر ٹھہرے تھے، بڑے خوش مزاج زور سے قہقہے لگاتے تھے بھاری بھرکم چھوٹے قد کے تھے یہ پہلی شخصیت تھی جن کو میں نے علامہ کو اقبال کہتے ہوئے سنا۔ یہ میرے لئے تعجب کی بات تھی کہ یہ شخص میرے والد کے اتنا قریب ہے کہ اقبال کہہ کر بلاتا ہے یہ کچھ روز ہمارے گھر ٹھہرے میری والدہ ان کے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکاتیں یہ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ ان دنوں ہم میکلوڈ روڈ رہا کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ علامہ کے آخری ایام میں پنڈت جواہر لال نہرو ان سے ملنے آئے جب پنڈت نہرو نے آنا تھا تو مجھے علامہ نے کہا کہ تم برآمدے میں ٹھہرو جب پنڈت نہرو آئیں تو ان کا استقبال کرنا اور میرے کمرے میں لے آنا۔ میں نے علامہ سے پوچھا کہ یہ پنڈت نہرو کون ہیں؟ تو فرمانے لگے کہ جس طرح مسلمانوں کے لیڈر قائداعظم محمد علی جناح ہیں اسی طرح ہندوؤں کے لیڈر نہرو ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ جس ماحول میں ایک بچے کی حیثیت سے میری پرورش ہوئی اسمیں سوچ مسلمانوں کی اور ہندوؤں کی علیحدہ علیحدہ ہو چکی تھی۔ اور یہی ہدایت میرے والد نے کی کہ یہ ہندوؤں کے اسی طرح لیڈر ہیں جس طرح ہمارے لیڈر محمد علی جناح ہیں جب پنڈت نہرو آئے تو میں نے انہیں آداب کیا

اور پنڈت جی میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اندر کمرے میں لے گئے۔ ان کے ساتھ بیگم افتخار الدین میاں افتخار الدین اور دو تین اور لوگ تھے ان دنوں علامہ زیادہ بیمار تھے اور وہ بستر پر بیٹھے ہوئے تھے کرسیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن پنڈت نہرو کرسی پر نہیں بیٹھے وہ فرش پر بیٹھے اسی طرح باقی لوگ بھی فرش پر بیٹھ گئے یہ واقعہ ان دنوں اخباروں میں بھی شائع ہوا اس ملاقات میں جو گفتگو ہوئی مجھے اس کا علم نہیں کیونکہ میں اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھا لیکن بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ علامہ کو یہ تاثر دیا گیا کہ اصل میں مسلمانوں کے لیڈر تو آپ ہیں، محمد علی جناح کی حیثیت تو اور طرح کی ہے اس بات سے علامہ ناراض ہوئے تھے اور ان سے جو یہ جملہ منسوب کیا جاتا ہے کہ "میں قائداعظم کا سپاہی ہوں" یہ فقرہ اسی ملاقات میں کہا گیا تھا۔

علامہ اقبال میرے ساتھ کھیلا بھی کرتے تھے۔ مثلاً میں کرکٹ کھیل رہا ہوں تو کہتے ہاں بھئی مجھے بیٹ دو میں انہیں باؤلنگ کرا کرا کے تھک جاتا تھا یہ ٹپ ٹپ کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح علامہ کو چونکہ بچپن میں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا اس لیے کھلے موسم میں اگر چھت پر میں پتنگ اڑا رہا ہوتا تھا تو یہ بھی آ جاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر اڑانے لگتے پیچ لڑاتے ان کو بچپن میں کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا۔ جب میں پیدا ہوا تو انہوں نے یہ عادت یکسر ختم کر دی کہ کہیں مجھے بھی یہ شوق نہ ہو جائے لیکن ان کی یہ خواہش آخر دم تک رہی کہ گھر کی چھت پر ایک بہت بڑا پنجرہ ہو جس میں بہت سارے کبوتر ہوں اور میری چارپائی ان کے درمیان رکھ دی جائے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کبوتروں کے پروں کے پھڑپھڑانے سے جو ہوا پیدا ہوتی ہے وہ صحت کے لیے بڑی مفید ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ان کے تصورات تھے۔

بنیادی طور پر میرے والد سخت گیر تھے۔ اس نسل میں اس قسم کا طریق کار تھا آج کے زمانے میں بچے جس طرح چاہیں کر لیں اس زمانے میں ایسا ماحول نہیں تھا ایک طرح کا ادب ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے انگریزی لباس پہننے کی اجازت نہیں تھی ان کے یہ احکام تھے کہ میں نے شلوار قمیض پہننی ہے اور کپڑا بھی قیمتی نہیں خریدنا یعنی اتنے آنے گز سے زیادہ کا کپڑا نہ ہو جوتے جو خریدنے ہیں ان کی قیمت آٹھ روپے سے زیادہ نہ ہو خرچ کرنے کے لیے مجھے ایک آنہ ملا کرتا تھا اگر انہیں یہ پتہ چلتا کہ میں فلاں رات چارپائی کے بجائے زمین پر سویا ہوں تو خوش ہوتے تھے ایک

مرتبہ مجھے صبح کی نماز پڑھتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ایک رباعی لکھی جس میں اس واقعے کا ذکر کیا کہ میں نے جاوید کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس میں ان کی کچھ دعائیں ہیں۔ یہ دعائیہ انداز کی کیفیت ہیں مجھے تو ایسی قربت کا بہت کم موقع ملا۔

اب میں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں یہ غالباً مئی 1936ء کا واقعہ ہے جب قائداعظم پہلی مرتبہ تشریف لائے محترمہ فاطمہ جناح ان کے ساتھ تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ چار بجے کے قریب قائداعظم نے آنا تھا۔ اس روز صبح مجھے علامہ نے بلایا اور کہا کہ شام کو ایک مہمان آئیں گے۔ تم اپنی آٹوگراف بک لے کر آنا ان سے دستخط لینا میں نے کہا بہت اچھا اس وقت بھی میں نے علامہ سے پوچھا کہ جناح صاحب کون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے قائد ہیں۔ جس وقت وہ تشریف لے آئے میں علامہ کے کہنے کے مطابق آٹوگراف بک لے کر گیا قائداعظم کے سامنے وہ کتاب رکھی۔ انہوں نے اس پر ایم اے جناح لکھا اور نیچے تاریخ لکھی۔ جب قائداعظم آٹوگراف بک پر دستخط کر چکے تو میری طرف دیکھ کر انگریزی میں فرمانے لگے "کیا تم بھی شاعر ہو" میں نے گھبرا کے کہا جی نہیں تو پھر دوسرا سوال ایک دم انہوں نے کیا "تو پھر تم بڑے ہو کر کیا بنو گے" اس سوال کا جواب میں نہ دے پایا میں خاموش ہو گیا تو پھر آپ نے علامہ صاحب کی طرف منہ کر کے کہا "اس نے کوئی جواب نہیں دیا" تو پھر میری طرف سے علامہ نے جواب دیا۔ کہ "اگلی نسل کو آپ نے بتانا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے "میری قائداعظم کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔

میرا رجحان سائنس کی طرف تھا سائنس کے مضامین میں میرے نمبر زیادہ آتے تھے۔ علامہ کا خیال مجھے ویانا بھیجنے کا تھا اس زمانے میں سائنس اور ڈاکٹری کی ڈگری کے لیے ویانا مشہور تھا۔ امریکہ یا برطانیہ کی اتنی ساکھ نہیں تھی جتنی ویانا کی تھی۔ لیکن اس طرح نہ ہوا کیونکہ ان کی وفات کے بعد میری دلچسپی سائنس کے ساتھ نہ رہی بلکہ آرٹس کی طرف ہو گئی فلسفے اور انگریزی ادب کی طرف زیادہ توجہ ہو گئی۔

علامہ کی عادات میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ حکیم سے علاج کراتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایلوپیتھی ادویات کڑوی ہوتی ہے اور حکیموں کی ادویات میں لذت ہوتی ہے یہ ان کی شخصیت کا شاعرانہ پہلو تھا۔ انہیں یونانی ادویات سے فائدہ بھی ہوا علامہ کا ایک بھائی اور چار بہنیں تھیں ان میں سب کی عمریں طویل ہوئی ہیں۔ علامہ کے والد کی عمر

95، 96 برس تھی انکے بڑے بھائی 82 برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ بہنیں بھی سوائے ایک کے 70، 80 برس کی عمر میں فوت ہوئیں۔ لیکن علامہ 63 سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ یہ شروع ہی سے صحت مند نہیں تھے کوئی نہ کوئی عارضہ جوانی ہی میں لاحق ہونا شروع ہوگیا تھا ان کی ایک آنکھ کی بینائی بہت کم تھی کہتے ہیں کہ ان کو پھنسیاں نکلا کرتی تھیں تو ان کی ماں نے جونکیں لگوا دیں اور وہ بھی کنپٹی پر جس سے ایک آنکھ کو نقصان پہنچا۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کو درد گردہ کا عارضہ ہوگیا یہ درد گردہ کی تکلیف حکیم نابینا کی ادویات سے ٹھیک ہوئی۔ اسی طرح کچھ عرصے بعد انہیں نقرس کی تکلیف ہو گئی۔ یہ تکلیف ان کو خاصی تنگ کرتی رہی پھر ان کا گلہ بیٹھ گیا بعد میں ان کا دل بھی بڑا ہونا شروع ہوگیا۔

علامہ خلوت پسند بھی تھے اسی طرح وہ محفل کے بغیر کبھی نہیں رہ سکتے تھے مقرر بہت اچھے تھے کیونکہ پروفیسر رہے تھے اردو اور انگریزی میں کافی عبور تھا فارسی کے کافی ماہر تھے لیکن میں نے انہیں کبھی فارسی بولتے ہوئے نہیں سنا اسی طرح عربی بھی بہت اچھی جانتے تھے لیکن زیادہ گفتگو پنجابی ہی میں کرتے تھے اگر ناراض ہوتے یا غصے میں ہوتے تو انگریزی بولتے تھے۔

جب علامہ کی زندگی کی آخری رات تھی بہت تکلیف میں تھے تو ان کے ایک عزیز ڈاکٹر عبدالقیوم نے کہا کہ میں آپ کو مارفیا کا ٹیکہ لگا دیتا ہوں اس پر علامہ نے کہا کہ میں مارفیا کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتا کیونکہ میں ہوش میں موت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں میں ہوش میں یہ تجربہ کرنا چاہتا ہوں کہ موت کیا ہوتی ہے میں بے ہوشی کی حالت میں مرنا نہیں چاہتا تو انہوں نے ٹیکہ لینے سے انکار کر دیا۔

جب علامہ کا آخری وقت تھا میں کمرے میں داخل ہوا تو فرمانے لگے کہ کون ہے کیونکہ آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا اس لیے پہچان نہیں سکتے تھے ایسے دھندلا سا عکس دیکھتے تھے میں نے کہا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس پڑے کہنے لگے جاوید بن کے دکھاؤ تو جانیں چودھری محمد حسین قریب بیٹھے ہوئے تھے ان کو کہنے لگے چودھری صاحب جاوید نامے میں میری جو آخری نظم ہے خطاب بہ جاوید وہ اس کو ضرور پڑھوا دیجئے۔ تو میں نے جو بھی کلام اقبال پڑھا ہے وہ چودھری محمد حسین ہی سے پڑھا ہے۔ دیوان غالب بھی مجھے انہوں نے پڑھایا پہلے مسدس حالی پڑھائی پھر دیوان غالب

اور اسکے بعد علامہ کا کلام پڑھایا۔

اپنی بیماری کے دوران کبھی کبھار علامہ مجھے بلا کر کہا کرتے تھے کہ "ہاں بھئی مجھے میری کوئی نظم گا کر سناؤ" تو میں انہیں ان کی نظم

"گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر"

گا کر سنایا کرتا تھا بسا اوقات مجھ سے اپنی نظمیں تحت اللفظ بھی سنتے جب میں نظم درست طریقے سے نہ پڑھتا تو ناراض ہوتے، مجھے کہتے کہ "یہ تم شعر پڑھ رہے ہو یا نثر" یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ شعر کو شعر کے انداز میں ہی پڑھا جائے مجھے اب تک یاد ہے اس سلسلے میں انہوں نے میری سرزنش کی تھی۔ میں نے خود کبھی شعر نہیں کہے میں سمجھتا ہوں، خاندان میں ایک ہی شاعر کافی ہوتا ہے ویسے تو علامہ بھی اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے تھے ان کا موقف تھا کہ میں نے شاعری کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے میرے کچھ خیالات ہیں جو میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ میں جلدی میں ہوں نثر میں اگر کوئی چیز کسی کو سمجھائی جائے تو بہت وقت لگتا ہے۔ میں نے لوگوں تک اپنے خیالات جلد پہنچانے ہیں اس لیے میں نے شاعری کا سہارا لیا اسلیے میں نے عقل کے بجائے دل کی بات دل سے کی ہے۔ علامہ کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی شخص بیٹھا رہتا تھا اس لیے ہمیں دو دو تین روز تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملتا تھا البتہ میری والدہ کی وفات کے بعد ان کا فرمان تھا کہ سکول جانے سے پہلے اور سکول سے واپس آنے کے بعد ان سے مل کر جایا جائے۔

علامہ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کرتے میری بہن منیرہ بھی اگر بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو فرماتے بال اس طرح نہ گوندھا کرو یہ یہودیوں کا انداز ہے۔

21۔اپریل 1938ء کو تقریباً صبح 5 بجے علامہ اقبال کی وفات ہوئی۔ مجھے یاد ہے لاہور میں ان کی وفات کی خبر جنگل ک آگ کی طرح پھیلی۔ صبح ہی سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آئے۔ ان کی میت ان کے سونے والے کمرے میں پلنگ پر پڑی تھی۔ علامہ کے آخری دیدار کے لیے بندوبست اس طرح کیا گیا تھا کہ لوگ ہال کمرہ سے داخل ہوتے اور غسل خانے میں سے باہر جاتے تھے۔

جنازہ شام کو 5، 6 بجے اٹھا۔ اس کا روٹ قلعہ گوجر سنگھ سے ہوتا ہوا، فلیمنگ

بازار میں سے گزر کر اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا- وہاں نماز جنازہ پڑھی گئی- وہاں سے موچی دروازے کے راستے جنازہ شاہی مسجد پہنچا- وہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی------ ان کو شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سائے میں دفن کیا گیا---- اس وقت تقریباً رات کے 9 بج گئے کیونکہ ان کے بڑے بھائی اور خاندان کے دیگر افراد کا انتظار تھا جنہوں نے سیالکوٹ سے آنا تھا- دفنانے کی جگہ سے متعلق بھی سیاسی تنازعہ رہا کیونکہ جب علامہ فوت ہوئے تو یہاں پر یونینیسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور وزیراعلیٰ سکندر حیات تھے- ان دنوں مسلم لیگ کی کانفرنس کلکتہ میں ہو رہی تھی، یہ سب لوگ کلکتے میں تھے- وہاں پر جناح سکندر پیکٹ کے سارے فیصلے ہونے تھے- یہ جناح سکندر پیکٹ وہ ہے جس کے حضرت علامہ بہت مخالف تھے- بہرحال ان کی فوتیدگی کی اطلاع سکندر حیات کو پہنچائی گئی جو غالباً اسی روز کلکتہ سے چل پڑے تھے اور انہوں نے لاہور پہنچنا تھا- علامہ کے احباب نے اس بات کا اظہار کیا کہ انہیں شاہی مسجد کے قریب دفن کیا جائے- مگر سکندر حیات نے اس کی مخالفت کی- اس نے کہا کہ مذکورہ جگہ مناسب نہیں ہے- یہ ساری تاریخی جگہ ہے اس لیے یہاں پر ان کو دفن نہیں کیا جانا چاہیئے بلکہ انہوں نے متبادل تجویز یہ دی کہ انہیں اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں دفن کیا جائے- بعد میں ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے سامنے نیلا گنبد چوک میں دفن کیا جائے جہاں آج کل فوارے لگے ہوئے ہیں-

علامہ کے احباب جن میں چودھری محمد حسین، میاں امیرالدین، راجہ حسن اختر، خواجہ عبدالرحیم اور دیگر شخصیات نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کو شاہی مسجد کے قریب ہی دفنایا جائے- اس زمانے میں سرہنری کریک گورنر تھا- ایک وفد ہنری کریک کو ملا- ہنری کریک نے فون کے ذریعے اجازت وائسرائے سے لی- چند ہی گھنٹوں میں اس نے اجازت دیدی کہ آپ اسی جگہ علامہ کو دفن کر سکتے ہیں جس جگہ آپ کی خواہش ہے- یہ معاملہ سکندر حیات کی مخالفت کے باوجود ہنری کریک نے طے کر دیا- جنازے میں لاہور کی تقریباً تمام ممتاز شخصیات نے شرکت کی- لاہور ہائیکورٹ کے جج، وکلاء، پروفیسر صاحبان، وزراء، نیلی پوش، خاکساروں کے جیش، سیاسی جماعتوں کے لیڈر، ہندوؤں اور سکھوں نے بھی جنازے میں شرکت کی- خاص طور پر نوٹ کرنے والی یہ [illegible] سے مسلمان نوجوان طلبہ جنازے میں شریک ہوئے- لوگ بہت زیادہ

تھے- جنازہ پیدل ہی شاہی مسجد تک لے جایا گیا- اس لیے چارپائی کے ساتھ طویل بانس باندھے گئے- نوجوان خاص طور پر بہت آہ وزاری کر رہے تھے- میں نے اپنی زندگی میں اس قسم کی صورتحال نہیں دیکھی کہ لوگوں نے اس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہو- میری اس وقت عمر ساڑھے تیرہ برس تھی- میں جنازے کے آخر میں دو دوستوں کے ساتھ خراماں خراماں چل رہا تھا-

اب چند سوال ذاتی نوعیت کے

س:- آپ بچپن میں کس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے-

ڈاکٹر جاوید اقبال:- ایک بار کرکٹ کھیل رہا تھا کہ گیند علامہ اقبال کے کمرے کے شیشے کو لگا جس سے شیشہ ٹوٹ گیا- وہ بڑے ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ آئندہ یہاں کرکٹ نہ کھیلا جائے- اس کو آپ شرارت تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ گیند دانستہ طور پر تو نہیں پھینکی گئی تھی- ایک واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مجھے ایک آنہ خرچہ کے لیے ملا کرتا تھا- یہ 30ء کی بات ہے میری عمر چھ سات برس کی تھی- پیسے والدہ دیا کرتی تھیں- ایک آنہ جو ملا وہ خرچ ہو چکا تھا- گلی میں ایک تکل بیچنے والا گزرا- میں والدہ کے پاس گیا اور کہا کہ میں نے تکل لینی ہے مجھے پیسے دو- انہوں نے کہا آپ کو ایک آنہ ملتا ہے وہ تم خرچ کر چکے ہو- انہوں نے پیسے نہ دیئے- بڑی سخت گرمی تھی- میں نے باہر آکر دیکھا تو خوانچہ والا بیٹھا ہوا تھا- میں نے کہا کہ پیسے تو ہے نہیں کیا تم پیتل لے سکتے ہو- اس نے کہا ہاں- اب مجھے سمجھ نہ آئے کہ پیتل کہاں سے لینا ہے علامہ صاحب کے کمرے میں ایک ٹیبل فین پڑا ہوا تھا- اس کے پیچھے ایک پیتل کی ٹوپی سی لگی ہوئی تھی- وہ ٹوپی اتارلی اور خوانچہ فروش کو دے دی اور اس سے تکل لے لی- اس دوران وہاں سے علامہ کا ڈرائیور فیروز گزر رہا تھا اس نے مجھے پیتل کا پرزہ خوانچہ فروش کو دیتے ہوئے دیکھ لیا- اس نے جا کے علامہ صاحب کو بتا دیا- اس شرارت کی سزا مجھے یوں ملی کہ علامہ صاحب نے اپنے کمرے میں بلا کر دو تین تھپڑ میری گردن پر جما دیئے- ایک اور واقعہ ہے- مثلاً فلم دیکھنے چلے جانا- 30-31-32ء میں فلم دیکھنا بہت بڑی بات ہوتی تھی- ان دنوں بڑے شوق سے

نوجوان فلم دیکھتے تھے۔ ان دنوں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ وہاں راکسی سینما تھا
سینما اور ہمارے مکان کے درمیان پارسیوں کا ایک ہوٹل تھا۔ جو میٹنی شو ہوتا تھا۔ اس
میں ہم فلم دیکھ کر گھر چلے جاتے تھے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا ہم اس روز پہلے شو میں
چلے گئے۔ رات کے آٹھ نو بج گئے۔ میرے لیے حکم یہ تھا کہ سورج غروب ہونے کے
بعد میں نے کہیں باہر نہیں جانا۔ اس روز لیٹ ہونے کی وجہ سے گھر میں کھلبلی سی
مچ گئی۔ کہ مجھے کوئی بھگا کر تو نہیں لے گیا۔ بڑی پریشانی کا عالم تھا۔ اس روز بھی علامہ
صاحب سے مار پڑی۔ میں شرارتی تو تھا لیکن کوئی خاص واقعات نہیں جو یاد ہوں۔ علامہ
صاحب سے شرارتوں کی سزا صرف ان دو واقعات پر ملی۔ البتہ ماں سے میں کافی مار
کھاتا رہتا تھا کیونکہ بچوں پر کنٹرول والدہ ہی کرتی تھیں۔ علامہ کا اس میں کوئی عمل دخل
نہیں تھا۔ ہماری والدہ کی کوشش بھی یہ ہوتی تھی کہ وہ اس میں دخل نہ دیں۔ ہماری ماں
اس اصول کی قائل تھیں کہ بچوں کو کھانے کے لیے سونے کا نوالہ دو لیکن دیکھو تو قہر
کی نظر سے۔ یہ ایک رویہ تھا اس زمانے کی ماؤں کا۔ یہ ڈسپلن کا ایک نظریہ تھا۔ مجھے
یاد نہیں پڑتا کہ میری ماں نے کبھی بھی مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا ہو۔ ویسے بہت
محبت کرتی تھیں۔ مجھے چومتی بھی اس وقت تھیں جب میں سویا ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کہ
جاگتے میں انہوں نے مجھے کبھی پیار کیا ہو۔ گو نو دس برس کی عمر تک وہ کھانا مجھے
اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھیں۔ علامہ اس پر خفا بھی ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کو خود
اپنے ہاتھ سے کھانا کھانا چاہیئے تاکہ اسے خود کھانے کا طریقہ آئے۔ رات کو زیادہ تر
ہمارے ہاں چاول پکتے تھے۔ پلیٹ میں میری والدہ چمچ رکھتی تھیں۔ جس سے مجھے چاول
کھلاتیں۔ جب وہ علامہ کے قدموں کی آہٹ سنتیں تو فوراً چمچ پلیٹ میں رکھ دیتیں اور
مجھ سے توقع کرتیں کہ میں خود چمچ سے چاول کھاؤں۔ مگر علامہ کو اس بات کا پتہ چل جاتا
تھا۔

س:۔ آپ کس قسم کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ ایک تو کرکٹ جس کا اس زمانے کے بچوں میں خاصا رواج تھا۔
دوسرا فٹ بال۔ سکول میں مجھے فٹ بال کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں بھی زیادہ تر
فٹ بال کھیلتا۔ تیسری پتنگ بازی کا شوق تھا۔ کرکٹ کھیلنے میں تو کبھی کبھی علامہ
بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ پتنگ بازی میں تو بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔

کیونکہ بچپن میں انہیں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا۔

س:۔ کیا علامہ صاحب آپ کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ نہیں۔ ان سے کبھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کالج کے
طلبہ کو تو پڑھانے میں ان کی راہبری کر سکتے تھے لیکن بچوں کو تعلیم دینا ان کے لیے
مشکل تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت بے صبرے تھے۔ بچوں کو تعلیم دینا یا پڑھانا بہت
مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے بچوں کی سطح پر آنا پڑتا ہے۔ البتہ ابتدائی ایام میں
والدہ سے کچھ پڑھا۔ میرے ایک ہندو استاد تھے ماسٹر تارا چند۔ انہی سے میں نے
ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میری جو خوشخطی ہے یہ بھی ماسٹر تارا چند کی وجہ سے تھی۔ وہ
بہت خوشخط تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر بید مار مار کر مجھے خوشخطی سکھائی۔ انہی
ماسٹر تارا چند کی وجہ سے ابتدائی مراحل میں کامیابی حاصل کر کے میں سنٹرل ماڈل
سکول میں آیا۔ وہ علامہ کے بہت منظور نظر تھے۔ وہ ایک دیہاتی تھے اور اپنی مونچھوں
کو دیسی گھی لگایا کرتے تھے۔ بالوں کو بھی تیل کے بجائے گھی لگایا کرتے تھے۔ ان
کے سر کے بال اور مونچھیں چمکتی رہتی تھیں۔

س:۔ آپ کس استاد سے متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ ابتدائی زندگی میں تو ماسٹر تارا چند سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس
کے بعد سنٹرل ماڈل سکول میں ماسٹر غلام ناصر سے متاثر رہا۔ سنٹرل ماڈل سکول میں
اور بھی بہت سے لائق استاد تھے۔ مثلاً ماسٹر طالع مند، گنڈا رام۔ اس زمانے میں
ہیڈ ماسٹر بھلا ہوا کرتے تھے۔ یہ کافی معروف شخصیات تھیں۔

س:۔ سکول میں آپ کو کس مضمون سے دلچسپی رہی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ آٹھویں جماعت تک تو میں سائنس میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ سائنس
کے مضامین میں بڑی دلچسپی تھی۔ یہاں تک کہ علامہ کا خیال تھا کہ میں ڈاکٹر بننا
چاہوں تو مجھے آسٹریا بھیج دیا جائے گا۔ اس زمانے میں ویانا میں میڈیکل سائنس کی
بہترین یونیورسٹی تھی۔ بعد میں میرا یہ شوق نہ رہا۔ ابتدا ہی سے مجھے اردو ادب سے
زیادہ دلچسپی تھی مگر میں نے شعر کبھی نہیں کہا میں نے اپنا سب سے پہلا افسانہ نویں
جماعت میں لکھا۔ گورنمنٹ کالج میں جب داخلہ لیا تو "راوی" میں میری تحریریں شائع
ہوتی رہیں۔ مجھے دیوان غالب چودھری محمد حسین نے پڑھایا۔ کلام اقبال بھی چودھری

صاحب سے پڑھا۔ مسدس حالی، مقدمہ شعروشاعری، غالب کے خطوط یہ سب کتابیں میں نے بی اے تک پڑھ لی تھیں۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا، عمر عیار، حاتم طائی یہ کتابیں پڑھ لی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے ہر طالبِ علم کو یہ کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اس طرح آپ کی اردو تحریر میں ایک خاص روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی شوق کی وجہ سے میں نے بعد میں فلسفہ لیا۔ ایم اے فلسفہ کے علاوہ انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ڈرامے کی طرف کیونکہ رجحان تھا۔ اس لیے مغربی ڈرامے میں سپیشلائز کیا۔ ابتدا میں ڈرامے بھی لکھے۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کے رسالے شائع ہوتے تھے۔ ان میں میرے اس قسم کے ڈرامے چھپتے تھے۔

س:۔ آپ کو کس مضمون سے نفرت تھی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ حساب سے جان چراتا تھا۔ مسلمان بچے عام طور پر حساب سے ہی جان چراتے ہیں۔

س:۔ بچپن کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ بچپن میں اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو انسان کی عقل اسے بھلا دیتی ہے۔ لیکن کوئی بہت خوشگوار یا حیران کن واقعہ ہو تو وہی ذہن میں رہ جاتا ہے۔ عام طور پر ایک روٹین ہی میں بچپن گزر جاتا ہے۔ میرے بچپن میں ایسی کوئی غیر معمولی بات کبھی نہیں ہوئی۔ جو میرے ذہن میں ہو یا جس نے میرے ذہن پر کوئی تاثر چھوڑا ہو۔ ایک واقعہ ہے کہ میں نے بچپن میں پہلی بار جس شخصیت کو انہیں علامہ اقبال کے بجائے اقبال کہتے ہوئے سنا۔ وہ مولانا محمد علی جوہر تھے۔ یہ غالباً 1929ء کا واقعہ ہے۔ میں غالباً چار یا پانچ برس کا ہوں گا۔ مجھے دھندلا سا ایک خیال ہے کہ انہوں نے میرے باپ کو اقبال کہہ کر بلایا ہے وہ میرے لیے ایک عجیب و غریب بات تھی۔ وہ بمبئی سے علامہ صاحب کو ملنے آئے تھے اور میرے لیے ایک چاکلیٹ کا ڈبہ بھی لائے تھے۔ یہ میرے لیے ایک انوکھا واقعہ تھا جو ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا تھا کہ میرے والد کو کوئی اقبال کہہ کر نہیں بلاتا۔ دوسری شخصیت جن کو میں نے اقبال کہہ کر انہیں مخاطب کرتے ہوئے سنا وہ سر راس مسعود تھے۔ کیونکہ ان کی علامہ سے بے تکلفی تھی۔ علامہ ان کو مسعود کہتے تھے۔ ایک اور واقعہ میرے ذہن میں ہے میری والدہ کا میرے والد کے ساتھ اس بات پر

تکرار کہ گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ آپ کوئی ملازمت کر لیں۔ یہ واقعہ 1931-32ء کا ہے۔ جب وہ مسلسل گول میز کانفرنسوں میں گئے۔ اور جو تھوڑی بہت پریکٹس تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ پریکٹس بھی ان کی اس قسم کی تھی کہ جب پانچ یا چھ سو کا کام آجاتا تھا تو آگے کیس لیتے ہی نہیں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میرا اس سے مہینے کا خرچ چل جائے گا۔ ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میری والدہ نے والد سے کہا کہ میں آپ کی باندی تو نہیں ہوں۔ میں کس طرح خرچ چلاؤں۔ آپ کوئی ملازمت کریں تاکہ مستقل آمدنی کی کوئی صورت ہو۔ اور یہ کہ اپنا کوئی مکان بنائیں۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔

س:۔ اس واقعہ پر علامہ صاحب کا ردعمل کیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ ان کا ردعمل کیا ہونا تھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستے رہے۔ غصہ کا اظہار والدہ کر رہی تھیں۔ جواب علامہ صاحب کے پاس کیا ہوتا سوائے اس کے کہ وہ ہنس دیتے۔ یہ وہ دور ہے جس کا علامہ نے اپنے خطوط میں بھی ذکر کیا ہے۔ کہ مجھے گول میز کانفرنسوں سے کیا ملا۔ میری جو تھوڑی بہت پریکٹس تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور ایک وکیل کے لیے گلا بیٹھ جانا تو اس کا خاتمہ ہے۔ آمدنی کا ذریعہ وکالت ہی تھی یا پھر پرچے دیکھتے تھے یا کتابوں کی رائلٹی تھی۔ رائلٹی تو ان کی زندگی میں کوئی زیادہ ملتی نہیں تھی۔ آپ تصور کیجئے۔ اسرار خودی چھپی تو اس کی رائلٹی ان کو 32 روپے ملی۔ تو کتابوں کی رائلٹی تو خاص آتی نہیں تھی۔ اس کے بعد گزر بسر بھوپال سے 500 روپے کے وظیفے پر ہوتی رہی۔

س:۔ سکول اور کالج کے ساتھیوں میں سے کوئی ایسا ہے جس نے آپ کی طرح نام پیدا کیا ہو۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ بہت سے ہیں۔ میرے سکول اور کالج کے ساتھیوں میں سے جو نامور ہوئے اس میں جسٹس اسلم ریاض حسین ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے پھر سپریم کورٹ کے جج رہے۔ آجکل وفاقی محتسب ہیں۔ پھر غلام مجدد مرزا ہیں۔ یہ پانچویں جماعت سے میرے ساتھ ہیں۔ یہ بھی جج بنے۔ چیف جسٹس بنے پھر سپریم [illegible] کے جج بنے۔ یہ دونوں میرے بے تکلف دوست ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی گزری

ہے۔ جسٹس اسلم ریاض صاحب کو تو میں پانچویں سے بھی پہلے کا جانتا ہوں۔ یہ جاوید منزل کے قریب ہی رہا کرتے تھے۔ گویا کہ ہم ایک دوسرے کو 35ء 36ء سے جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ غلام مرتضےٰ پراچہ ہیں جو اب ریٹائر ہو کے پبلک سروس کمیشن کے رکن ہیں۔ یہ ایگزیکٹو سروس میں چلے گئے تھے۔ کالج کے زمانے میں چودھری نذیر مومن دوست تھے۔ یہ فنانس ڈیپارٹمنٹ میں بہت اونچا رتبہ حاصل کر کے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مومن مجھے اس طرح یاد ہے کہ یہ اس زمانے میں شاعری کرتے تھے۔

احمد رضا بخاری جو کمشنر انکم ٹیکس ہو کر ریٹائر ہوئے یہ بھی میرے کلاس فیلو تھے۔ بھٹو کے کیس میں جو وعدہ معاف گواہ بنے یعنی مسعود محمود یہ بھی سنٹرل ماڈل سکول کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں، میں ان کو مسعود محمود ضامن کے طور پر جانتا تھا ضامن ان کا تخلص تھا۔ یہ بھی شاعر تھے۔ سکول کے رسالے میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔

تعلیم اور ادب سے دلچسپی

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ جب علامہ کی وفات ہوئی اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میں سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ میری تعلیم کی ابتداء سیکرڈ ہارٹ مشن ہائی سکول سے ہوئی تھی۔ وہاں میں 9 سال کی عمر تک رہا۔ اس کے بعد ایک اور مشنری سکول سینٹ فرانسس میں مڈل کیا۔ پانچویں جماعت سے سنٹرل ماڈل سکول میں داخلہ لیا۔ ایک سال اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں بھی پڑھا۔ وہیں سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔۔۔۔ یہاں سے میں نے دو ایم اے کیے۔ پہلے انگریزی کا ایم اے کیا دوسرا فلسفے کا کیا۔ اس دوران چودھری محمد حسین نے مجھے دیوان غالب، مسدس حالی کی کتابیں پڑھائیں اور اس کے بعد علامہ اقبال کا کلام پڑھایا اور جاوید نامہ کے آخر میں بھی دعا پڑھوائی۔ میری جہاں تک اردو ادب کے ساتھ نسبت ہے یہ سب کچھ چودھری محمد حسین کی بدولت ہے جو ایک طرح سے میرے معلم بھی تھے اور ولی بھی تھے۔ علامہ نے اپنی وفات سے پیشتر ہی ولی مقرر کر رکھے تھے۔ میں اتنی دیر انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے نہ جا سکا جب تک میری چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہو گئی۔ گھر کا سارا انتظام چودھری محمد حسین ہی کے ذمے تھا۔ ہماری والدہ تو فوت ہو چکی تھیں اس لیے علامہ کی زندگی ہی میں ایک جرمن خاتون نے ہمیں پالا۔ بالخصوص میری چھوٹی بہن کو۔۔۔۔ گھر کی دیکھ بھال جرمن خاتون کے ذمہ تھی، ہم دونوں اسی کے زیرسایہ پلے۔۔۔۔ علامہ کے پرانے ملازمین مثلاً علی بخش اور رحما بھی ہمارے ساتھ رہے۔ اس طرح ولیوں نے کوئی تبدیلی نہ آنے دی بلکہ نظام اسی طرح چلتا رہا جس طرح علامہ کی زندگی میں چلتا تھا۔

البتہ ان کی وفات کے بعد کچھ مدت کے لیے ہماری مالی حالت مخدوش رہی۔ کیونکہ بھوپال سے پانچ سو روپے ماہوار کا جو وظیفہ انہیں ملتا تھا وہ وفات پر بند ہو گیا اور
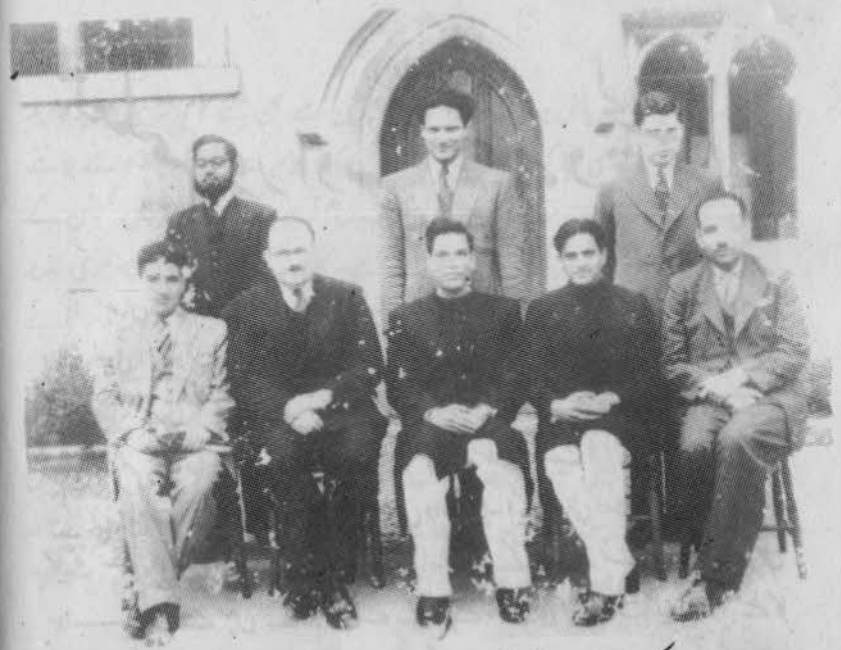
1949ء میں کیمبرج یونیورسٹی پاکستان ایسوسی ایشن کا اجلاس تصویر میں پروفیسر آربری اور جاوید اقبال نظر آرہے ہیں۔

جو کچھ سرمایہ ان کے بینک میں تھا وہ تجہیز و تکفین پر صرف ہوگیا۔ مالی مشکلات کا یہ دور مئی سے لے کر ستمبر تک رہا اور اس دوران کسی بھی ملازم نے تنخواہ نہ لی اور بغیر تنخواہ کے کام کرتے رہے۔

اسی دور میں پاکستان قائم ہوتا ہے۔ جب پاکستان بنا اس وقت میں ایم اے کا طالب علم تھا کالج میں میری دلچسپی زیادہ لٹریچر کی طرف ہوگئی۔ خاص طور پر چودھری محمد حسین کی معیت میں دیوان غالب پڑھا تو میرا اردو کی طرف ذوق بڑھ گیا۔ انگریزی ادب کے ساتھ اگر مناسبت ہوئی تو مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ ڈرامہ تھا۔ یہ میرا وہ دور ہے جس میں میں نے اردو ادب کے ساتھ ڈرامے کی صنف میں بہت سارے تجربات کئے اور ساتھ ہی کچھ افسانے بھی لکھے۔ جن کو آج تک جمع نہیں کیا جاسکا۔ لیکن اس دور میں ترقی پسند ادب میں ایک نئی جہت تھی۔۔۔ ڈرامے بھی لکھے۔ میرے ڈرامے ریڈیو پر نشر بھی ہوئے۔ کالج میگزین "راوی" میں بھی میری

تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ادب لطیف اور دیگر ترقی پسندوں کے رسالوں میں لکھتا رہا۔۔۔۔۔ اداکاری بھی کی۔ جن دنوں مجھے ڈرامے کا شوق تھا انہی دنوں اداکاری کا بھی شوق ہوا۔ ڈرامے کا ایک کامیاب شو شملہ میں ہوا۔۔۔۔۔ ہم نے رابندر ناتھ ٹیگور کا

1950ء میں کیمبرج یونیورسٹی پاکستان ایسوسی ایشن کے اجلاس میں ابراہیم رحمت اللہ پاکستان ہائی کمشنر اور ان کی بیگم پاکستانی طلبہ کے ساتھ۔ ڈاکٹر عبد السلام، جاوید اقبال اور اعجاز بٹالوی نمایاں ہیں۔

ایک ڈرامہ "پوسٹ آفس" وہاں سٹیج کیا۔ اس ڈرامے کا اردو ترجمہ ہم نے کیا۔۔۔۔۔ یہ بہت کامیاب پیشکش تھی۔ یہ ڈرامہ تین دن چلنا تھا لیکن ایک ہفتے تک چلتا رہا۔ لاہور میں اوپر ائیر تھیٹر میں ہم نے دوبارہ پروڈیوس کیا۔ یہاں بھی یہ ڈرامہ مقبول

ہوا---- یہ ٹیگور کا پہلا ڈرامہ تھا جس کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا- پاکستان
کے قیام کے بعد میری ترقی پسندوں سے ٹھن گئی- میرے اور احمد ندیم قاسمی صاحب
کے درمیان نصب العین کے مسئلے کے موضوع پر ایک ادبی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا- اس
سلسلے میں ہم دونوں کی طرف سے مضمون اور جواب مضمون لکھے گئے جو مولانا چراغ
حسن حسرت نے بڑے اہتمام کے ساتھ امروز میں شائع کیے- ترقی پسندوں کا موقف یہ
تھا کہ ہندوستان کی تقسیم محض جغرافیائی ہے- لیکن تمدنی اور ادبی طور پر ہم ایک ہیں-
میرا مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم جغرافیائی نہیں بلکہ تمدنی امتیاز کی بنا پر ہوئی
ہے- اس لیے ہمیں اب پاکستانی ادب تخلیق کرنا چاہیئے-

پاکستان کے قیام کے بعد میری خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک
سے باہر جاؤں- مگر میرے ولی بالخصوص چودھری محمد حسین کا یہ کہنا تھا کہ جب تک تم
اپنی چھوٹی بہن کی شادی نہیں کر دیتے، اس وقت تک میں پسند نہیں کرتا کہ تم باہر
جاؤ- پھر یہی صورت ہوئی کہ مجھے ایم اے (فلسفہ) کرنے کے بعد کچھ ماہ انتظار کرنا پڑا
تاکہ منیرہ کی شادی ہو جائے- منیرہ کی شادی مارچ 1949ء میں میاں صلاح الدین
صاحب کے ساتھ ہوئی- اسی سال یعنی ستمبر 49ء میں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان
روانہ ہوا- وہاں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا-

میرے گورنمنٹ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں گو ہندوؤں اور مسلمانوں کے
درمیان اختلافات تھے لیکن کبھی یونیورسٹیوں میں اس طرح کا تشدد نہیں ہوتا تھا- جس
طرح کہ آج کا ماحول ہے- اختلاف سیاسی ہوتے تھے- اس کے باوجود دوستیاں بھی
قائم رہتی تھیں------ اس طرح کے حالات نہیں تھے جو آج کے طالب علموں کے
درمیان ہیں-

مجھے یاد ہے کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض طالب علم کمیونسٹ ہوتے
تھے بالخصوص ہندوؤں میں تو وہ کسی نہ کسی وجہ سے کالج میں ہڑتال کرواتے تھے تو اس
کے لیے وہ گیٹ پر کھڑے ہو جاتے تھے کہ جی آج ہڑتال ہے، کوئی اندر نہ جائے- تو
ہم کہتے تھے کہ جی چھوڑو، چھوڑو ٹھیک ہے- اس طرح ہم اندر جا کے کلاسیں اٹنڈ
کرتے تھے- مطلب یہ ہے کہ کوئی طالبعلم کسی دوسرے کو مجبور نہیں کرتا تھا کہ کلاس
میں نہ جاؤ یا امتحان نہ دو-

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں ہم نے اپنی منزل کو پایا یعنی پاکستان
حاصل کیا تب تک طالبعلم سیاست میں دلچسپی رکھنے کے باوجود اپنی تعلیمی سرگرمیوں
میں اس قسم کی کسی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے تھے- اب یہ صورت ہو گئی ہے
کہ کوئی پڑھنے کو تیار ہی نہیں ہے- اور انہوں نے سیاست میں اپنے آپ کو بہت
ملوث کر رکھا ہے- میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت ہم
جمہوریت کے زیادہ قائل تھے- بہ نسبت آج کے جمہوریت سے مراد خاص قسم کا نظام
حکومت نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ آپ اخلاقی طور پر ایک دوسرے کے نظریات کو
برداشت کرنا سیکھیں- بجائے اس کے کہ آپ تشدد پر اتر آئیں---

اس زمانے میں جمہوریت زیادہ تھی جوں جوں وقت گزرتا گیا ہم جمہوریت سے
دور ہٹتے گئے- جمہوریت آہستہ آہستہ ہمارے رگ و پے ہی سے نکلتی جا رہی ہے کیونکہ
ہم میں رواداری نہیں ہے نہ اتنا برداشت کا جذبہ جو قیام پاکستان کے وقت تھا-

میری زیادہ دلچسپی فلسفے میں تھی کیونکہ میں نے فلسفہ ابتداء میں نہیں پڑھا تھا-
ایم اے ہی میں فلسفہ کا مضمون پڑھا اور میں یونیورسٹی بھر میں اول آیا اور گولڈ میڈل
حاصل کیا--- ایک تو فلسفے میں میری دلچسپی تھی، دوسری لٹریچر میں دلچسپی تھی-
لٹریچر میں ذوق انگریزی ادب سے منسلک ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا- میں نے اردو کی
معروف کتابوں کو پڑھا- میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل کو بھی ان کتابوں کا
مطالعہ کرنا چاہیئے- ان کتب کا تعلق صرف شاعری ہی سے نہیں بلکہ نثر سے بھی ہے-
مثلاً راشدالخیری کے ناول عبدالحلیم شرر کے ناول، فسانہ آزاد، حالی کی کتب، مقدمہ
شعروشاعری وغیرہ- مولانا شبلی کی تصانیف و دیگر کتابیں- آغا حشر کے ڈرامے- اس
کے علاوہ شاعری میں مجھے زیادہ نسبت غالب ہی سے رہی- غالب کے بعد حالی پھر
اقبال کو پڑھا- جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے کہ میں کس صنف کو اپناؤں تو وہ نثر
تھی- شاعری میں نے آج تک نہیں کی- میں نے ڈرامے کی صنف کو اپنایا-

3 یا 4 ستمبر 1949ء کو میں لاہور سے کراچی روانہ ہوا تاکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے
کے لیے انگلستان پہنچوں- لاہور ریلوے سٹیشن پر دیگر احباب کے علاوہ چودھری محمد
حسین بھی مجھے الوداع کہنے کے لیے پہنچے ہوئے تھے- چودھری صاحب نے اس موقع پر
مجھے کہا- "علم شکار کرنا علم"- کراچی سے میں نے بحری جہاز کے ذریعے انگلستان جانا

جاوید اقبال بی بی سی لندن سے 1951ء میں مشرقی سروس کے لئے خطاب کر رہے ہیں۔

تھا۔ میرے ساتھ جسٹس دین محمد کے صاحب زادہ محمد معظم بھی انگلستان جا رہے تھے اس وقت جسٹس دین محمد سندھ کے گورنر تھے۔ ہم جہاز پر سوار ہوئے اور بحری سفر کا آغاز ہوا۔ جہاز راستے میں عدن رکا اور پھر نہر سویز کے راستے سکندریہ پہنچا۔ سکندریہ میں بھی جہاز کچھ عرصہ کے لیے رکا اس کے بعد بحیرہ روم میں سے گزرتے ہوئے، جبل الطارق کو عبور کرتے ہوئے لیورپول پر سمندری سفر ختم ہوا۔ لیورپول سے ریل گاڑی میں لندن پہنچے۔ کچھ ہفتے لندن میں قیام کرنا پڑا۔ محمد معظم بار ایٹ لاء کرنے

گئے تھے اس لیے وہ لندن ہی میں ٹھہرے۔ میں نے کیونکہ کیمبرج پہنچنا تھا اس لیئے وہاں سے چل دیا کیمبرج میں، میں نے پیمبروک کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پر میرا مقصد پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ میرے استاد یا سپروائزر پروفیسر آربری تھے جنھوں نے نہ صرف اسلامی تمدن پر بہت کچھ لکھ رکھا ہے بلکہ علامہ اقبال کی دو کتابوں کا انہوں نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ یعنی رموز بے خودی اور زبور عجم کا۔ بعد میں انہوں نے جاوید نامہ کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کیمبرج میں پی ایچ ڈی کے موضوع کی تلاش کے لیے کافی دقت پیش آئی۔ پروفیسر آربری کا خیال تھا کہ میں امام غزالی کے فکر کے نفسیاتی پس منظر کے حوالے سے مقالہ لکھوں۔ لیکن عربی میں میری اتنی شد بد نہیں تھی کہ میں اس موضوع کو چن سکتا۔ دوسرا میرا خیال تھا کہ یہ موضوع ادق فلسفے کا موضوع تھا۔ اس کی کوئی عملی قدر میری نگاہ میں نہیں تھی اس لیے میں نے چودھری محمد حسین صاحب سے خط و کتابت کی اور ان سے پوچھا کہ آپ میری رہنمائی کریں کہ کس قسم کا موضوع منتخب کیا جائے۔ آخر یہ موضوع چنا گیا۔ "مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقا برصغیر ہندو پاکستان کے حوالے سے"۔

اس موضوع کو منتخب کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ میں اپنی تربیت اس طرح کروں کہ اس ملک کی سیاسی زندگی میں شریک ہو سکوں۔ میری یہ خواہش تھی کہ اس ملک میں ایک ایسی مسلم سوسائٹی وجود میں لائی جائے جو نئی ہو اور جس میں وہ ساری خصوصیتیں ہوں جو کہ ایک ایسے معاشرے کی خصوصیات ہوتی ہیں جو آگے بڑھنا چاہتا ہو۔ یعنی اس میں تخلیق اور ایجاد کا مادہ ہو۔ اس میں تجسس ہو جو ملک کی ترقی کا باعث بنے۔ چودھری محمد حسین نے اس موضوع کو پسند کیا اور پروفیسر آربری نے بھی اسے منظور کر لیا اس موضوع پر میں نے کام کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ لندن میں بار ایٹ لاء کی کلاسیں بھی اٹینڈ کرنی شروع کر دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا انکشاف مجھے کیمبرج میں ہوا کہ مغرب میں جو بھی تحقیق کی جاتی ہے اس سے پہلے مقصد کا تعین کیا جاتا ہے یعنی وہ تحقیق برائے تحقیق، نہیں بلکہ تحقیق برائے مقصد ہوتی ہے۔ ہم یہاں سمجھ بیٹھے ہیں کہ فلاں شخص بڑا اسلام دوست ہے اگر مغرب میں کوئی مستشرق اسلام دوست ہو تو پھر مسلمان کیوں نہ ہو جائے، تو یہ ہمارے ہاں احساس کمتری ہے ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب میں جو بھی

کوئی اسلام سے دلچسپی کا اظہار کرے یا اسلامی تمدن سے دلچسپی رکھے وہ اسلام دوست بن جاتا ہے۔ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر وہ کوئی موضوع چنتے ہیں تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ سب سے پہلے پیش نظر اپنے ملکی مفاد ہوتے ہیں۔ مثلاً اب دیکھئے پروفیسر آرنلڈ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے استاد تھے اور انہوں نے علامہ کو تربیت دی اور ان کی صحیح سمت راہبری کی یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت علامہ نے ان کی بڑی تعریف کی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے پروفیسر آرنلڈ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہوا ہے۔

علامہ اقبال آرنلڈ کی وفات سے مغموم تھے مگر انہوں نے جواب دیا کہ ان کا اسلام سے کیا تعلق اس نے تو اپنے ملک کی خدمت کی ہے اسلام کی اس نے کیا خدمت کرنی ہے۔ اسی طرح آرنلڈ نے ایک کتاب خلافت کے موضوع پر لکھی۔ اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جو ترکی خلیفہ تھے یعنی عثمانی خلیفہ کی خلافت جائز نہیں۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ اسلامی دنیا کے حصے بخرے ہو جائیں۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے یہ مفاد میں تھا تاکہ مسلم دنیا کے اتحاد کو غلط ثابت کیا جا سکے۔ تو ہمیشہ مغرب میں تحقیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ یہ چیز میں نے وہاں سے سیکھی۔ ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہئیے کہ تحقیق برائے تحقیق نہیں ہونی چاہئیے۔ حضرت علامہ نے جب تحقیق کی عجم میں فلسفے کا ارتقاء تو اس تحقیق کے نتیجے میں اس وقت بھی ان کے ذہن میں جو خاص بات تھی، جو مقصد تھا وہ یہ کہ مسلمانوں کے زوال، انحطاط کا باعث کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کا باعث تین چیزیں ہیں۔ ایک مطلق العنان سلطنت دوسری ملا ازم اور تیسرا تصوف۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مقالے میں سب سے زیادہ حملہ وجودی تصوف پر کیا۔ جس نے مسلمانوں میں عمل کی قوت ختم کر دی تھی۔ اور اس لٹریچر نے مسلمانوں کو ایک ایسی تقدیر کے تصور میں مبتلا کر دیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور انسان کا اس دنیا میں کوئی کردار نہیں لیکن اقبال نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ یہ تو شیطانی استدلال ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جو بھی برے، اچھے کام کرتے ہیں اس کا ذمہ دار خدا ہے کہ اس نے پہلے ہی سے اس کو متعین کر رکھا ہے تو پھر غلام رہنا بھی حق بجانب ہو گیا۔

جب میں پڑھنے کے لیے انگلستان گیا تو مذہب کے متعلق میرے خیالات میں انتشار تھا اگر مجھے اسلامی عقیدے یا تمدن سے وابستگی پیدا ہوئی تو اسی ماحول میں ہوئی جہاں مجھے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

میرے دو استاد تھے ان میں سے ایک یہودی پروفیسر روبن لیوی تھے اور دوسرے کٹر عیسائی یعنی پروفیسر آربری تھے۔ باہر انکے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ اسلام دوست ہیں میں نے کیونکہ ان کے ساتھ کام کیا تھا اس لیے میں جانتا تھا کہ ان کے ہاں ایک خاص تعصب جو یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں اسلام کے خلاف ہوتا ہے وہ موجود تھا اس کا اظہار خواہ وہ کتابوں میں نہ کریں، لیکن کہیں نہ کہیں ہو جاتا تھا۔ تعظیم میں اپنے ان دونوں اساتذہ کی کرتا رہا۔ لیکن میں ان دونوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوا۔ کیمبرج اور لندن میں جو میرا تعلیم کا دور ہے اس میں میرے ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالسلام اور داؤد رہبر (جو بعد میں عیسائی ہو گئے) تھے۔ ہم نے کیمبرج میں پاکستان سوسائٹی بنائی تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر عبدالسلام نے اکٹھے ہی انجمن بنائی تھی۔ سوسائٹی کے سرپرست پروفیسر آربری تھے۔ اس زمانے میں اور بھی شخصیات تھیں جو ہمارے ساتھ شامل ہوتی رہیں۔ ایک اسلامی انجمن تھی جو ہم نے قائم کر رکھی تھی۔ اس انجمن کے صدر بھی پروفیسر آربری تھے۔ وقتاً فوقتاً اس زمانے میں ابراہیم رحمت اللہ جو پاکستانی ہائی کمشنر تھے، وہ بھی پاکستانی طالب علموں کو ملنے اور خطاب کرنے آتے تھے۔ بعد میں اصفہانی صاحب ہائی کمشنر ہوئے تو ان کی وابستگی بھی پاکستانی طالب علموں کے ساتھ رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پی ایچ ڈی یا ڈاکٹریٹ کر لینے سے کوئی شخص عالم نہیں بن جاتا صرف علم کے کنارے تک پہنچتا ہے۔ تہہ تک نہیں پہنچتا۔ یہ ایک سطحی سی چیز ہوتی ہے جس کو ڈاکٹریٹ کہا جاتا ہے لیکن اس سے آپ پر ایک طرح سے علم کا دروازہ کھلتا ہے۔ آج جب میں اپنا تحقیقی مقالہ پڑھتا ہوں تو اس کی خامیاں نظر آتی ہیں کیونکہ گزشتہ برسوں میں میرے نظریات زیادہ مضبوط ہوئے ہیں اور علم میں اضافہ ہونے سے انسان کے کئی خیالات بدل جاتے ہیں۔ البتہ بنیادی تصور میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔

انگلستان سے میری واپسی ستمبر 1956ء میں ہوئی تقریباً سات برس وہاں رہا وہاں بار ایٹ لاء اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان سات برسوں میں مجھے یورپی تمدن کو

دیکھنے کا بڑا اچھا موقع ملا۔ میں صرف انگلستان ہی میں نہیں رہا بلکہ چھٹیوں میں یورپ چلا جاتا تھا۔ کبھی فرانس کبھی جرمنی، کبھی اٹلی، کبھی سپین۔ ان تمام ممالک کی اس زمانے میں بطور طالب علم سیاحت کی اس زمانے میں یورپ اتنا مہنگا نہیں تھا۔ جب میں گیا ہوں تو کوریا کی جنگ جاری تھی۔ پونڈ کی قیمت 9 روپے تھی۔ مجھے مہینے کے پچاس پونڈ ملتے تھے۔ میرے لیے وہ وافر تھے۔ کچھ آمدنی میری دیگر ذرائع سے بھی ہو جاتی تھی کیونکہ بی بی سی نے مجھ سے لیکچروں کا سلسلہ شروع کرایا تھا یہ ایسٹرن سروس کے لیے ہوتا تھا۔ "اے لیٹر فرام کیمبرج" کے عنوان سے لیکچر دیا کرتا تھا یہ سلسلہ تقریباً ایک برس تک جاری رہا۔

اس کے ساتھ ہی میرا آرٹ میں بھی رجحان ہوا۔ میں نے تصویریں بھی بنائیں اور بت تراشی بھی سیکھی۔ مجھے آئل پینٹنگ کا علامہ کی زندگی میں یہ شوق تھا میرے انگریز دوست یہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے تمدن میں اس قدر رچ بس گیا ہوں کہ میں واپس پاکستان جا کر کس طرح اپنے آپ کو ایڈجسٹ کروں گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں واپس آیا اور فرش پر بیٹھ کر ہاتھ سے روٹی کھائی تو چھ سات سال کا جو یورپی تمدن کا اثر تھا سب کا سب ایک لمحے ہی میں ختم ہو گیا۔

انگلستان جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ میرا انداز فکر وسیع ہو گیا۔ جب میں پاکستان پہنچا تو چودھری محمد حسین فوت ہو چکے تھے۔ وہ 1951ء میں فوت ہو گئے جس طرح حضرت علامہ کو ابتدائی دور میں میر حسن جیسے استاد ملے پھر آرنلڈ کی زیر تربیت انہوں نے انگلستان میں کام کیا۔ بدقسمتی سے مجھے اس قسم کے اساتذہ نہیں ملے۔ نہ پاکستان میں اور نہ کیمبرج میں۔ تعلیمی دور میں اگر میں کسی سے متاثر ہوا ہوں تو وہ چودھری محمد حسین صاحب کی شخصیت تھی۔ جن سے میں نے فلسفہ، مسدس حالی، غالب اور کلام اقبال پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی وفات کا مجھ پر بہت اثر ہوا کیونکہ وہ میرے باپ کی جگہ ہی نہیں تھے بلکہ دوست بھی تھے۔ علمی اور روحانی طور پر میرے رہبر بھی تھے۔ علامہ اقبال کی وفات پہ مجھے اس طرح تنہائی محسوس نہیں ہوئی جتنی چودھری صاحب کی وفات پر میں نے محسوس کی کہ میں اب بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ سات سال بعد ستمبر 1956ء میں جب میں انگلستان سے لاہور پہنچا تو عزیز و اقارب سب لاہور سٹیشن پر موجود تھے لیکن دل میں ایک خلش سی تھی۔ میں نے چودھری صاحب کے

صاحب زادوں کو ان کی تربت پر لے جانے کو کہا۔ ہم میاں امیرالدین صاحب کے ہمراہ سٹیشن سے اقبال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کی سیاہی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہم سب گاڑی میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کیونکہ مجھے ایک بار پھر اس خوف نے آلیا تھا جس کی موجودگی کا احساس کئی بار مجھے کیمبرج اور لندن کی سرد اور تاریک راتوں کی تنہائی میں ہو چکا ہے۔ میں رہ رہ کر سوچتا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا، اب میرا کیا بنے گا۔ میرے نظریات اور عقائد کی تصحیح کیونکر ممکن ہو گی۔ خوداعتمادی تو وقت نے سکھا دی لیکن بغیر کسی کی رہبری کے خودشناس کیونکر بنوں گا۔ اسی عالم میں ہم اقبال پارک پہنچ گئے اور چودھری صاحب کی لحد کی طرف پیدل چلنے لگے۔ چودھری صاحب کے تینوں صاحب زادے میرے آگے تھے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ صاحب زادے ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا اس لیے میں نے نفیس سے پوچھا "کہاں ہیں چودھری صاحب" وہ بولا یہ ہیں۔ میں نے تاریکی میں فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن فاتحہ پوری نہ ہوئی تاریکی نے مجھے رلایا۔ بہت رلایا۔

واپسی پر میاں امیرالدین کہنے لگے۔ چلو یہاں تک آئے ہو تو علامہ کے مزار پر بھی ہوتے چلو۔ مزار کی تکمیل وہ آخری کام تھا جو چودھری صاحب نے انجام دیا۔ لیکن میرے لیے تو چودھری صاحب کی لحد پر حاضر ہونا ہی علامہ کے مزار کی زیارت کے برابر تھا۔ مگر چلتے چلتے معاً مجھے محسوس ہوا جیسے رات کی خاموش تاریکی میں چودھری صاحب میرے ساتھ آملے اور مجھے مزار اقبال کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ گویا انہیں میرے احساس زیاں کی پرواہ نہیں ہے۔ گویا ان کا انتقال تو ایک فطری امر تھا جسے اتنی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ زندہ لوگوں کے انجام دینے کے لیے بہت سے ایسے فرائض ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور جو لوگ اہم فرائض انجام دیتے ہیں وہ کب مرتے ہیں۔ کیا اقبال مر چکا ہے؟۔ کیا محمد حسین مر چکا ہے؟۔

علامہ اقبال باپ کی حیثیت سے

اپنی زندگی میں علامہ صاحب نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا ہو گا جس سے میں ان کی شفقت یا اس الفت کا اندازہ لگا سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ والدین بچوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں، انہیں گلے سے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں مگر مجھے آپ کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کبھی گھر میں منہ اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے۔ گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کیے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں عنفوان شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخلیقی تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسا نہ رکھتا تھا۔ بہر حال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ رکھتا تھا۔

ہر گھر کی باتیں چھوٹی چھوٹی
ہوا کرتی ہیں مگر ان سے گھر کے افراد کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات والدین میں اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تنازع بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ابا جان اور اماں جان میں میری وجہ سے کئی بار تکرار ہو جاتی۔

میں بچپن میں بے حد شریر تھا۔ پڑھائی سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے اماں جان سے مار کھانا میرا معمول بن چکا تھا۔ اماں جان بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک ایسے اصول کی پابند تھیں جو نہایت سخت تھا وہ اکثر کہا کرتیں کہ اولاد کو کھانے کو دو سونے کا نوالہ لیکن دیکھو قہر کی نظر سے۔ اسی اصول کے پیش نظر، گو میں ان کے ہاں بارہ برس کے شدید انتظار کے بعد پیدا ہوا، مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے

مجھ پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ میں نے اتنا سن رکھا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مجھے پیار کرتیں سوتے کے عالم میں کرتیں تاکہ مجھے علم نہ ہو سکے۔ شاید اسی لیے بچپن میں میرے ذہن سے یہ خیال بھی گذرا کرتا کہ میری ماں دراصل میری حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔

بہر حال ابا جان سے میں نے بہت کم مار کھائی ہے۔ میرے لیے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ ابا جان جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے "احمق آدمی! بیوقوف !!"

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اگر ابا جان نے میری کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اماں جان بیچ میں آ کھڑی ہوئیں اور انہیں روک دیا۔ یا اگر اماں جان نے مجھے ضرورت سے زیادہ پیٹا تو ابا جان خفا ہوئے کہ بچے کو اس بے دردی سے نہیں مارنا چاہئے۔ ایک دفعہ میں آنکھوں پر پٹی باندھے اماں جان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور منہ کے بل گر پڑا۔ جس کی وجہ سے ہونٹ کٹ گیا اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے اسی لحظے ابا جان زنانے میں داخل ہوئے اور اچانک میرے منہ سے یوں خون بہتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

ہم گھر میں شور نہ مچا سکتے تھے۔ اگر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ باہر دالان میں کبھی کرکٹ کھیل رہا ہوتا تو ہمیں حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو اور ہم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتے۔ لیکن بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جایا کرتے۔

ہمارے گھر میں کھانا اماں جان پکایا کرتی تھیں۔ ان کی مدد کے لیے ایک اور خاتون بھی تھیں جنہیں میں بڑی اماں کہا کرتا۔ ان کے علاوہ ہماری کوٹھی کے پیچھے نومسلموں کا ایک محلہ تھا جس کی لڑکیاں اماں جان سے قرآن مجید کا سبق لینے آتیں، سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کا کام کاج بھی کرتیں۔

دو ایک مرتبہ میں ابا جان اور اماں جان کے ساتھ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب دادا جان بقید حیات تھے، گو بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اپنے کمرہ میں ہمیشہ چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ میں ان کے پاس جاتا تو آنکھوں کو اپنے ہاتھ کا سایہ دے کر مجھے دیکھتے اور پوچھتے کہ کون ہے۔ جب میں اتنا بتاتا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس پڑتے، طاق میں سے

ایک ٹین کا ڈبہ اٹھاتے اور اس میں سے برفی نکال کر مجھے کھانے کو دیتے۔ سیالکوٹ کے مکان میں یا محلہ چوڑیگراں کی گلیوں میں جہاں میں بھاگتا پھرتا تھا وہیں ابا جان کا بچپن بھی گزرا تھا۔

میرے بچپن میں رمضان کا مہینہ سردیوں میں آیا کرتا اور عید بھی سردیوں میں آتی تھی۔ رمضان کے دنوں میں اماں جان باقاعدہ روزے رکھتیں اور قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ مجھے سحری کھانے کا بے حد شوق تھا اور ایک آدھ بار ابا جان کے ساتھ سحری کھانا بھی یاد پڑتا ہے۔ وہ روزہ کبھی کبھار رکھتے تھے اور جب رکھتے تو ہر نصف گھنٹہ کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں عموماً ابا جان کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی، لیکن اس شب گرم پانی سے اماں جان مجھے نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے پہنے جاتے، عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے، مجھے ہر عید اماں جان پہنایا کرتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی پہنتا اور مجھے کلائی پر باندھنے کے لیے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے میرے لیے تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ سج دھج کر میں ابا جان کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کے لیے جاتا۔ ان کی انگلی پکڑے، شاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرتا۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم گھر آتے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ وہ عید کے روز سیویوں پر دہی ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ سارا دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور دن کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو اماں جان سونے کی گھڑی اور اچکن اتروا لیتیں اور پھر اگلی عید تک مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

کبھی بیمار ہوتا تو اماں جان اور ابا جان بہت پریشان ہو جاتے۔ میرے سرہانے روپوں کے نوٹ رکھے جاتے اور کھیلنے کے لیے اماں جان مجھے نو اشرفیاں دیتیں جو میری پیدائش کے وقت ابا جان کے مختلف احباب سے بطور تحفہ ملی تھیں۔ اماں جان کا خیال تھا کہ اگر بچہ بیمار ہو اور اسے کھیلنے کے لیے روپے یا اشرفیاں دی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ ابا جان مجھ سے بار بار پوچھتے کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا اور

اگر میں انکار سے سر ہلاتا تو کہتے: "منہ سے بولو بیٹا! سر مت ہلاؤ؟" میرا بچپن زیادہ تر تنہائی میں گذرا۔ 1930ء میں منیرہ پیدا ہوئی لیکن وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی اس لیے ہم اکٹھے کھیل بھی نہ سکتے تھے۔

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے جب میں پہلی بار اسکول گیا۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال کی ہو گی۔ اماں جان بڑی فکرمند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دور کیسے رہ سکوں گا۔ ابا جان انہیں دلاسا دیتے رہے لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کوئی نہیں گیا۔ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو اماں جان برآمدے میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ ابا جان بھی اپنے کمرہ سے اٹھ کر آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔ بعد میں اسکول جانا ایک معمول بن گیا۔

مجھے موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون بجانے کی اجازت تھی کیونکہ ابا جان ایسی چیزوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ البتہ گانا سننے کا انہیں شوق ضرور تھا۔ اور اچھا گانے والوں کو جب کبھی گھر بلوا کر ان سے اپنا یا اوروں کا کلام سنتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیا کرتے۔ فقیر نجم الدین مرحوم ابا جان کو اکثر ستار بجا کر سنایا کرتے تھے۔ خود ابا جان کو جوانی میں ستار بجانے کا شوق رہ چکا تھا۔ لیکن جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے تو اپنی ستار کسی دوست کو دے گئے۔ 1931ء میں جب گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔

اماں جان کی بڑی آرزو تھی کہ ابا جان تمام دن گھر پر پڑے رہنے کی بجائے کہیں ملازمت کر لیں۔ یہ سن کر ابا جان عموماً مسکرا دیا کرتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں میں نے بھی اس معمّے کو سلجھانے کی بارہا کوشش کی کہ میرے ابا جان کیا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مجھ سے یہ سوال کر بیٹھتا تو میں خاموش ہو جاتا، کیونکہ میں خود نہ جانتا تھا۔ اسی طرح اماں جان اس بات پر مصر رہتیں کہ کرائے کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بنوائیے۔ ان ایام میں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

چند سال بعد اماں جان کے گھر کے اخراجات سے بچائے ہوئے روپوں سے زمین خریدی گئی اور "جاوید منزل" کی تعمیر شروع ہوئی۔ زمین اور مکان اماں جان کے

نام تھے اور انہی کی ملکیت تھے۔ بہر حال جب تعمیر مکمل ہو گئی تو ہم میو روڈ پر اٹھ آئے۔ لیکن اماں جان نئے گھر میں بیمار گاڑی ہی پر لائی گئیں کیونکہ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں۔ انہیں چارپائی پر لیٹے اندر لایا گیا۔ دوسرے دن اباجان جب انہیں دیکھنے کے لیے زنانے میں آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ آپ نے اماں جان سے کہا کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو۔ لیکن اماں جان نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں انشاءاللہ جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ لیکن ابا جان نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اس پر انہوں نے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں "جاوید منزل" میرے نام منتقل ہو گئی۔ اباجان نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا کرایہ ہر ماہ کی 21۔ تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں قدم رکھنے کے تیسرے یا چوتھے روز اماں جان پر اچانک غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب مجھے ان کے پاس لے جایا گیا تو وہ بستر پر بیہوش پڑی تھیں۔ میں نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا کہ اماں جان میری طرف دیکھئے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ لحظہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی شام انہوں نے غشی کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہا اور رات کو دفن کر دی گئیں۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر دس برس تھی اور منیرہ کی چار برس۔

اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے اباجان کے کمرے کی طرف گئے۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا اور صاف نہ بول سکتے تھے۔ میں اور منیرہ ان کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے

گویا ہوئے: "تمہیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو، تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔" اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

گرمیوں میں ابا جان باہر سوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے اکثر اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس غرض کے لیے بھی بلواتے کہ میری پائینتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال دو۔

اباجان کی عادت سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ لیکن جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

ابا جان کو میں نے بیسیوں مرتبہ خودبخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بیجان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت ہی پر نیت باندھ لیتے، دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی، دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔

اماں جان کی وفات کے بعد ابا جان صرف ایک بار زنانے میں آئے اور وہ بھی جب مجھے بخار آتا تھا۔ آپ کو پہلی بار تب معلوم ہوا کہ زنانہ حصہ میں کمروں کی تعداد

کتنی ہے۔ اسی طرح اماں جان کی وفات کے بعد ابا جان نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں از سر نو خضاب شروع کرنے کو کہا تو مسکرا کر بولے۔ "میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں" میں نے پھر کہا۔ "لیکن، ابا جان! ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔" چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی مہینوں بعد پھر چھوڑ دیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کو کہوں۔

اماں جان کی وفات کے کوئی دو ایک سال بعد منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے ابا جان نے ایک جرمن خاتون کو علی گڑھ سے بلوایا اور وہ ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ ہم انہیں "آپا جان" کہا کرتے۔ ان دنوں ہماری گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ ہم سب ابا جان سمیت دوپہر اور رات کا کھانا کھانے والے کمرہ میں کھایا کرتے۔ منیرہ اور "آپا جان" ہر شام ابا جان کے پاس بیٹھا کرتیں۔ ابا جان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس لیے "آپا جان" سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے اور منیرہ کو بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

مجھے مصوری سے بھی دلچسپی تھی لیکن اباجان کو میرے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے خاصی اچھی بن گئی۔ ان دنوں تایا جان سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے اور ہمارے ہاں مقیم تھے۔ تایا جان خود انجینئر تھے لیکن جب انہوں نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بے حد خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر ابا جان کو دکھانے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ ابا جان کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر میں نے بنائی ہے لیکن جب یقین آ گیا تو میری حوصلہ افزائی کرنے لگے کچھ عرصہ بعد انہوں نے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے میرے لیے خاص طور پر آرٹ کی کتابیں منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکاروں کو دیکھ کر میرا مصوری کے لیے شوق بڑھے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ جب میری نظر سے مصوری کے شاہکار گذرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصویریں نہیں بنا

سکتا۔

ابا جان کی تمنا تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میرے لیے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوا دیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹ باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ پھر بڑی عید کے روز مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت میں وہاں موجود رہوں۔ لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اباجان میں قوت برداشت کی انتہا تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔

ابا جان کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے قرآن مجید پڑھا ہے۔ ان کی آواز بڑی پیاری تھی، اباجان جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۃ مزمل پڑھی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے۔ "تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیئے۔" اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا، اور خاص طور پر وہ بند ----- جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا"

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یارسولؐ اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

اپنی زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اباجان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالات زندگی ہیں۔ اباجان دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خالد بن ولید اور فاروق اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے

آئے تھے اور واسکوڈی گاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا راستہ دکھایا۔

مجھے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلہ لگ گئی۔ اور اس کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پر آ گئے لیکن میں نے الف لیلہ کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کرنے کی بجائے الف لیلہ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں ناکامیاب ہوگیا۔ جب اباجان کو علم ہوا کہ میں الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکامیاب رہا ہوں تو برہم نہ ہوئے۔ کہنے لگے۔ "اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔"

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں اباجان نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا کیونکہ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصہ کے لیے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم بڑے خوش تھے کہ اباجان کے ہمراہ کشمیر جا رہے ہیں۔ لیکن کشمیر میں اباجان کا داخلہ ممنوع تھا۔ لہٰذا انہوں نے حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی۔ مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادی کشمیر میں کچھ دن گذارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

بطور ایک جج

آپ لاہور ہائی کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس رہے اس کے بعد آپ سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ بطور جج آپ کی مدت ملازمت تقریباً 18-19 برس بنتی ہے۔ چند سوال میں آپ کی اسی ملازمت کے حوالے سے پوچھنا چاہوں گا۔

س: کہا جاتا ہے کہ آپ کو بطور ہائی کورٹ جج بھٹو صاحب کنفرم نہیں کر رہے تھے اور آپ نے بڑی مشکل سے کنفرمیشن حاصل کی۔ یہ کیا راز ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ میں نے بڑی مشکل سے کنفرمیشن حاصل کی۔ یحییٰ خان کے دور میں میری تقرری بطور ایڈیشنل جج کے ہوئی تھی۔ دو برس بعد جب کنفرمیشن کا وقت آیا تو اس وقت ذوالفقار علی بھٹو صاحب وزیراعظم تھے۔ جن دنوں میری کنفرمیشن کے کاغذات بھٹو صاحب کے پاس تھے۔ انہی دنوں اتفاق سے آغا شورش کاشمیری صاحب بھٹو صاحب سے ملنے گئے تو انہوں نے آغا صاحب سے کہا کہ جاوید اقبال کی کنفرمیشن کی فائل میرے پاس آئی ہوئی ہے میں آپ کے ذریعے انہیں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ یہ بند کمرے میں بیٹھ کر فیصلے کیوں کرتے ہیں۔ انہیں میری طرف سے کہیے کہ ملک کی سیاست میں حصہ لیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ آغا شورش صاحب نے یہ پیغام مجھے دیا تو میں نے آغا صاحب کو کہا کہ آپ بھٹو صاحب کو بتا دیجیے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ملکی سیاست میں میں کوئی مثبت رول ادا کر سکتا ہوں اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ بند کمرے ہی میں فیصلے کروں۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کھلی فضا میں قوم کے فیصلے کئے جائیں۔ یا قوم کی تقدیر کے ساتھ کھیلا جائے۔ آغا شورش کاشمیری صاحب نے بھٹو صاحب کو اطلاع دے دی۔ اس کے بعد کنفرمیشن ہو گئی۔ اس میں کوئی ایسا راز تو نہیں تھا۔ بھٹو صاحب اور میں آپس میں دوست بھی تھے اور میں انتخابات میں ان کا مدمقابل امیدوار تھا۔ وہ جیت گئے اور میں ہار گیا لیکن انہوں نے اپنے طور پر ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے اس کا ازالہ کروں۔۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے نہ میں نے انہیں کوئی موقع

دیا اور نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی۔ ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب انہوں نے پشاور اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جج صاحبان کو ہٹا دیا۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں یہ قانون بنایا گیا کہ جو بھی چیف جسٹس ہو وہ چار برس تک اپنے عہدے پر رہے۔ اس کے بعد وہ سپریم کورٹ چلا جائے یا فارغ کر دیا جائے۔ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سردار محمد اقبال تھے اسی قانون کے تحت انہیں فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد قدرتی امر تھا تگ و دو شروع ہوئی کہ کون چیف جسٹس بنے گا۔ عام حالات میں جو اگلا سینئیر جج ہوتا ہے وہ چیف جسٹس بنتا ہے۔ اس طرح مولوی مشتاق کا نمبر تھا۔ بہرحال ان کو چیف جسٹس نہ بنایا گیا۔ مجھ سے اس سلسلے میں رابطہ کیا گیا۔ اس زمانے میں سینارٹی کے حساب سے میرا چودھواں نمبر تھا۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ وزیراعظم آپ کو چیف جسٹس بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے مختلف ذریعوں سے ان کو کھلوایا کہ ایسا نہ کیا جائے۔ مثلاً اس وقت چیف جسٹس یعقوب علی تھے انوار الحق صاب اس وقت سپریم کورٹ کے سینئر جج تھے اور ان دنوں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار تھے۔ میں نے معذرت کی کہ چودھویں نمبر پر ہونے کی وجہ سے میں چیف جسٹس بننا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں اپنے سینئر ساتھیوں کا حق غصب نہیں کرنا چاہتا۔ میرے لیے تو یہ بھی باعث عزت ہے کہ میں ہائی کورٹ کا جج ہوں۔ اگر میرے نصیب میں ہے تو وقت آنے پر قدرت مجھے چیف جسٹس بنا دے گی لیکن میں اس کو اس طرح حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ بھٹو صاحب نے میری یہ بات منظور کر لی اس طرح میں چیف جسٹس نہ بنایا گیا میری بجائے جسٹس اسلم ریاض حسین صاحب کو چیف جسٹس بنایا گیا۔ ان کا سنیارٹی کے حساب سے آٹھواں نمبر تھا۔

س:۔ عدلیہ میں بدعنوانی عروج پر ہے کیا آپ سمجھتے ہیں ہمارے ہاں بغیر پیسوں کے انصاف مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ بدعنوانی کا مسئلہ نچلی عدالتوں کا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری جو اوپر کی عدالتیں ہیں مثلاً ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔ ان کو اس طرح ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ میری ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں 18 برس سروس بطور جج رہی۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کسی کولیگ پر اسطرح کی الزام تراشی درست نہ ہو گی۔ البتہ نچلی عدالتوں میں کرپشن ہے۔ مجھے جب بھی شکایات موصول ہوتی تھیں، میں اپنے طور پر

چیف جسٹس محمد افضل ظلہ - جاوید اقبال - جسٹس نسیم حسن شاہ

ایکشن لیتا رہا۔۔۔۔ میرے چار سالہ چیف جسٹس کے دور میں مجھے جب کسی نچلی عدالت کے جج کے بارے میں کوئی شکایت موصول ہوتی یا جن جج صاحبان کی شہرت اچھی نہ تھی، ان کو فارغ کر دیا جاتا رہا لیکن اسکا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہماری نچلی عدالتوں کی حالت خراب ہے۔ جج صاحبان کے کمرے بہت چھوٹے ہیں بلکہ میں یہ دیکھ کر متعجب ہوتا تھا کہ بعض جج صاحبان ان حالات میں کس طرح کام کر رہے ہیں۔ مثلاً آپ تحصیلوں یا ضلعوں میں چلے جائیے۔ میں نے اپنے دوروں میں یہ دیکھا کہ نچلی عدالتوں کے جج صاحبان کن حالات میں کام کرتے ہیں۔ مثلاً بعض جج صاحبان کے کمرے اتنے ہیں جتنا آپ کا غسل خانہ ہو گا۔ کیسوں کی بھرمار ان کے سامنے ہوتی ہے اس چھوٹے سے کمرے میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے کہ آپ صحت مند رہ ہی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ جب کوئی جج کسی ضلع میں ٹرانسفر ہو کر جاتا ہے تو اس کے لیے رہائش کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تحصیلدار، اے سی یا ڈپٹی کمشنر کسی جگہ مقرر ہوتا ہے تو اس کو ہر قسم کی سہولت ملتی ہے۔ اس کی رہائش کا انتظام ہوتا ہے، اس کو کار ٹرانسپورٹ کے لیے ملتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے عدلیہ کی طرف آج تک کسی حکومت نے توجہ نہیں دی۔ لہٰذا جج کا سب سے پہلا مسئلہ مکان تلاش کرنے کا ہوتا ہے۔ مکان اس کو بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس مکان میں وہ رہ رہا ہوتا ہے اسی مالک مکان کا

مقدمہ اس کے سامنے آیا ہوتا ہے یا ایسا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ پھر اس کو ٹرانسپورٹ کی سہولت نہیں تو جب وہ کسی دورے پر جاتا ہے تو اکثر سائل بھی اسی بس میں اسکے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے وقار کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اصل میں رہائش تنخواہ اور سہولتوں کے مسائل حل کیے جانے چاہئیں۔ اب وہ جج جس کے سامنے روز تیس چالیس مقدمے لگے ہیں۔ ان کا سننا ہے اور فیصلہ اپنے ہاتھ سے لکھنا ہے کیونکہ اس کو ٹائپسٹ کی سہولت میسر نہیں۔ ٹائپ مشین ہی نہیں۔ اس کی تو انگلیاں لکھ لکھ کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان حالات میں کرپشن کو دور کرنے کے لیے ہمیں اور ذرائع بھی استعمال کرنے چاہئیں۔ جس وقت میں چیف جسٹس تھا تو حکومت کی توجہ بارہا ان مسائل کی طرف مبذول کروائی۔ میرا کہنا یہ تھا کہ آپ جج صاحبان کے لیے بھی اسی طرح اکیڈمی بنائیں جہاں انہیں اسی طرح تربیت دی جائے جس طرح سی ایس ایس والوں کو دیتے ہیں۔ جس وقت جج کسی جگہ ٹرانسفر ہو کر جائے تو اس کے لیے حکومت نے رہائش کا پہلے سے انتظام کیا ہو، اسی طرح اسے ٹرانسپورٹ کی سہولت میسر ہو اور اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔ تاکہ وہ پروقار طریقے سے اپنی زندگی بسر کر سکے۔ حکومت عدلیہ سے بہت زیادہ ریونیو حاصل کرتی ہے لیکن جو وہ عدلیہ پر خرچ کرتی ہے وہ اس سے بہت کم ہے۔ اس طرح عدلیہ کی آزادی کو بھی محدود کر دیا جاتا ہے کیونکہ جب ہمیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہائی کورٹ کے معاملے میں صوبائی حکومت اور سپریم کورٹ کے معاملے میں مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک ہاتھ اوپر ہو اور ایک ہاتھ نیچے ہو تو نیچے والے ہاتھ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ ججوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جائے۔ انگریزی مقولہ ہے کہ "اگر انصاف میں تاخیر ہو تو اس کا مطلب ہے انصاف مل نہیں رہا"۔ جب کیسوں کی بھرمار ہو اور ججوں کی کمی ہو تو نچلی عدالتوں میں کیس کو جلد لگوانے کے لیے رشوت چلتی ہے۔ جب تک یہ حالات درست نہ کئے جائیں میں نہیں سمجھتا کہ رشوت ستانی ختم ہو سکے گی۔ اس کا ایک پہلو تعزیری اور ایک اصلاحی ہے۔ ہمیں عدلیہ میں اصلاحی پہلو کی ضرورت ہے۔

س:۔ کیا ہماری عدلیہ پوری طرح آزاد ہے یا اس کے فیصلوں پر انتظامیہ اثرانداز ہوتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ جہاں تک انتظامیہ کا فیصلوں پر براہ راست اثرانداز ہونے کا تعلق ہے وہ تو درست نہیں میں نے اپنی اٹھارہ برس عدلیہ کی سروس کے دوران نہیں دیکھا کہ انتظامیہ نے براہ راست مداخلت کی ہو۔ اگر ہم پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ابتدا میں ہم پر انگریزوں کے بنائے ہوئے طریقوں کا اثر تھا، اس لیے عدلیہ کا بہت وقار تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں عدلیہ کا یہ عالم تھا کہ علامہ اقبال وکالت کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کو فلسفے کے پروفیسر کی ضرورت پڑی کیونکہ فلسفے کا جو انگریز پروفیسر تھا وہ انتقال کر گیا، تو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کا جو انگریز پرنسپل تھا اس نے علامہ اقبال کو کہا کہ آپ جزوقتی پڑھا دیا کریں انہوں نے کہا کہ میرے صبح مقدمے لگے ہوتے ہیں جب تک چیف جسٹس اجازت نہ دے میں صبح آکر پڑھا نہیں سکتا۔ چیف جسٹس سے اجازت لینے کے لیے پرنسپل نے صوبائی سیکرٹری تعلیم کو کہا۔ صوبائی سیکرٹری نے دلی میں مرکزی سیکرٹری تعلیم کو کہا۔ وائسرائے اور گورنر تک یہ بات گئی کہ چیف جسٹس کو اس مسئلے پر منا لیا جائے۔ ججوں کی میٹنگ ہوئی۔ پہلے تو وہ نہیں مانے۔ مگر جب انہیں محسوس ہوا کہ بہت شدت سے ضرورت ہے تو وائسرائے یا گورنر کے کہنے پر انہوں نے اجازت دی کہ آپ کے کیسز کی سماعت 11 بجے کے بعد کر لی جائے گی۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ انگریز کے زمانے میں عدلیہ کا کیا وقار تھا۔ کہ وائسرائے اور گورنر بھی چیف جسٹس سے بات کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ یہ صورت شروع میں پاکستان میں بھی رہی کیونکہ انگریزی نظام کا اثر تھا۔ رفتہ رفتہ یہ صورت ختم ہوتی چلی گئی۔ ختم اس طرح ہوتی چلی گئی کہ سب سے پہلے تو آپ مولوی تمیزالدین والے کیس کو دیکھیں۔ مولوی تمیزالدین والے کیس میں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے اسمبلی توڑ دی۔ تو مولوی تمیزالدین نے بطور سپیکر کے سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا جو سندھ ہائی کورٹ نے منظور کر لیا۔ یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں آیا سپریم کورٹ نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا اور اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ ملک غلام محمد کو بھی سپریم کورٹ نے مجبور کیا کہ وہ ان کے فیصلوں کو تسلیم کریں۔ یہ پاکستان بننے کے ابتدائی سات آٹھ برس تھے کہ پاکستان کی عدلیہ کا وقار اتنا تھا۔ اس کے بعد جب آمریت کا دور آتا ہے یعنی جب ایوب خان نے

اقتدار سنبھالا، تو آپ سب کو معلوم ہے کہ نظریہ ضرورت کے تحت جو فیصلہ سپریم
کورٹ کا آیا ہے، اس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد مسلسل مارشل لاء لگتے
رہے۔ اس میں نظریہ ضرورت ہر مرتبہ کسی نہ کسی شکل میں آگے آتا رہا۔ پھر سپریم
کورٹ کے فیصلوں سے یہ صورت پیدا ہو گئی کہ یحییٰ خان نظریہ ضرورت کے تحت تو
حاکم تسلیم کیا گیا لیکن جب وہ ہٹ گیا تو اسی سپریم کورٹ نے اسے غاصب قرار دیا۔
جب ضیاءالحق کا دور آتا ہے تو اسی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ "ریاستی ضرورت"
کے تحت محدود وقت کے لیے مارشل لاء جائز تھا آخر کار عدلیہ کی یہ کیفیت ہو گئی کہ
یہاں پر جو سیاسی اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے اس کے مطابق اس نے فیصلے دیئے ہیں۔ اس
بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عدلیہ بذات خود ایک مکمل طور پر بااختیار
ادارہ ہے لیکن جس سرعت کے ساتھ عسکری مارشل لاء ملک میں لگتے رہے ہیں اور
عسکری حاکم آتے رہے ہیں اب فرض کیجئیے کہ عدلیہ یہ فیصلہ دیتی کہ یہ غاصب ہیں۔
اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ججوں کو فارغ کر

طارق فاروق اور تنویر ظہور نے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے ان کے چیمبر میں ملاقات
کی جب وہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

دیتے۔ اس طرح ہمارے ملک میں سیاسی بے ترتیبی کے ساتھ ایک اور بے ترتیبی
بھی آجاتی۔ امام غزالی کا ایک قول ہے جو عوام الناس کے لیے ایک نصیحت ہے۔ ان
کے زمانے میں بھی بادشاہتیں بدلتی رہتی تھیں۔ ایک سلطان آیا اس نے تلوار کے
زور سے دوسرے کو گرایا اور خود تخت پر بیٹھ گیا تو یہ سلسلہ روز جاری رہتا تھا۔ اس لیے
امام غزالی نے فرمایا کہ ظلم برداشت کرلو، لیکن نظم و نسق میں خرابی نہ آنے دو۔ تو یہ
ہماری تاریخ کا ایک طرح کا قاعدہ رہا ہے۔ امام غزالی کے انداز میں سوچیں تو عدلیہ نے
ان حالات میں جو فیصلے دیئے وہ ایک اعتبار سے درست تھے کیونکہ ان کا مطمع نظر یہ تھا
کہ ملک میں افراتفری کا عالم پیدا نہ کیا جائے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آپ یہ کہہ سکتے
ہیں کہ اگر ایک چیز قانونی طور پر غلط ہے تو اس کے بارے میں برملا اظہار کیا جائے۔
خواہ اسکا انجام کچھ بھی ہو۔ پہلا نظریہ عملی اور مبنی بر مصلحت ہے لیکن دوسرا جذباتی اور
تخیلی۔

س:۔ آپ دونوں میں سے کس نظریے کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری عدالتیں جو کرتی رہی ہیں ان کا انداز فکر
ایک اعتبار سے درست ہے کیونکہ یہ کہہ دینا بڑا آسان ہے کہ آپ نے استعفیٰ کیوں نہ
دے دیا۔ مگر اس وقت کئی ترجیحات ججوں کے ذہن پر حاوی ہوتی ہیں۔ اگر آپ امام
غزالی کے مقولے کو سامنے رکھیں تو نظم و نسق کی ابتری سے یہ بہتر ہے کہ وقتی طور
پر استبداد کو قبول کر لیا جائے۔ یہاں مارشل لاء لگتے رہے کسی نے انگلی تک نہیں
اٹھائی۔ سب اسے قبول کرتے رہے تو آپ عدلیہ سے کیونکر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ خلا
میں کام کرے یا فیصلے دے۔ جج بھی اسی قوم کا حصہ ہیں جس قوم پر یہ افتاد آتی جاتی
ہے۔ میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں جو فیصلے کئے گئے وہ درست تھے
کیونکہ ملک کے سیاسی عدم استحکام کے سبب ایسی صورت پیدا کر دی گئی تھی۔ اور
آئندہ بھی ایسے ہو سکنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ اس
بات پر بھی غور کیجئیے کہ جب کبھی بھی مارشل لاء لگایا جاتا ہے تو انتظامیہ کو عدلیہ پر
دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ عدلیہ آئین کی تخلیق ہے۔ یعنی عدلیہ کے قیام
کا باعث آئین ہے۔ جب بھی مارشل لاء لگتا رہا ہے آئین کو ختم کر دیتے رہے ہیں یا
آئین معطل ہوجاتا رہا ہے۔ جب آئین ہی معطل ہو گیا تو پھر عدلیہ کی حیثیت وہی ہے

جو اسے آمر عطا کرے۔ کیونکہ وہ اس کے تمام اختیارات لے لیتا ہے۔ وہ اپنی مارشل لاء عدالتیں قائم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم فلاں فلاں امور عدلیہ کے اختیار میں نہیں دیں گے اور فلاں دیں گے۔ جب اختیار ہی نہیں رہتا تو پھر دباؤ کس بات کا۔ جہاں تک عدلیہ کا اختیار قائم رہا ہے اس نے یقیناً آزادانہ طور پر کام کیا ہے۔

س:۔ اعلیٰ عدلیہ کے کس جج کی قابلیت نے آپ کو متاثر کیا اور کیوں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ جو بھی میرے سینئر کولیگ تھے ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ عدلیہ کے میدان میں ہم نے بہت قابل شخصیتیں پیدا کی ہیں قیام پاکستان کے بعد جسٹس عبدالرشید تھے۔ اس زمانے میں، میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کے بعد بھی عدلیہ نے بڑی قدآور شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً جسٹس محمد منیر، جسٹس اے۔ آر کارنیلیس، جسٹس ایس اے رحمان، اور جسٹس شہاب الدین۔ پھر جب میں انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے پاکستان آیا اور یہاں وکالت شروع کی تو اس وقت لاہور میں جسٹس ایس اے رحمان چیف جسٹس تھے۔ ان کے بعد جسٹس کیانی چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ اور بعد ازاں اہم نام شیخ انوارالحق، سردار اقبال اور مولوی مشتاق صاحبان کے ہیں۔ یہ ساری شخصیتیں اپنے اپنے زمانے کی نامور شخصیتیں تھیں۔ میں تو عدلیہ میں سیاست سے بیزار ہو کر آیا تھا۔ یہاں بہت ہم آہنگی تھی۔ پھر سپریم کورٹ میں جب میں گیا تو وہاں حلیم صاحب چیف جج تھے۔ حلیم صاحب بھی بہت بلند پایہ جج تھے۔ اس وقت جو چیف جسٹس پاکستان ہیں محمد افضل ظلہ بہت ہی دانا اور قانون کی سمجھ بوجھ رکھنے کے ساتھ ہی انسانی خوبیوں اور انسانی کمزوریوں سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ یہ جج کے لیے بہت ضروری ہے۔ جج ایک مشین یا کمپیوٹر نہیں ہوتا کہ وہ ہر معاملے میں قانون کے متن میں ہی گرفتار ہو کے رہ جائے اسے اپنا ضمیر بھی استعمال کرنا پڑتا ہے ایک جج کے لیے وسیع النظری کی بڑی ضرورت ہے۔

س:۔ میرا پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ ججوں میں سے ایک آدھ ایسی شخصیت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ میں کسی ایک کا نام تو نہیں لے سکتا۔ وقتاً فوقتاً ہر ایک سے مجھے رہبری ملتی رہی ہے۔ جن اصحاب کے میں نے اوپر نام لیے ہیں یہ میرے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے نزدیک علامہ اقبال کا

بہت احترام تھا اور مجھے ان کا فرزند سمجھتے ہوئے ہر ایک نے میرے ساتھ محبت اور شفقت کا سلوک کیا جب میں ہائی کورٹ کا جج بنا اس وقت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شیخ انوارالحق تھے اس کے بعد سردار اقبال اور مولوی مشتاق رہے۔ سبھی کا برتاؤ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس لیے میں کسی ایک شخصیت کا نام نہیں لے سکتا۔ مجھے ان سب کی رہبری حاصل رہی۔

س:۔ مولوی مشتاق صاحب متنازعہ شخصیت تھے۔ کیا آپ ان سے بھی متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ ایک لحاظ سے متنازعہ ہر شخصیت ہوتی ہے۔ متنازعہ تو میں بھی ہوں۔ متنازعہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کے ماسوا ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے۔ لیکن کسی کے متعلق سوچنے یا رائے قائم کرنے کا انداز یہ ہے کہ آپ اس کی خامیوں کو علیحدہ رکھیں اور خوبیوں کو علیحدہ رکھیں۔ پھر کوشش یہ کریں کہ اس کی خوبیاں آپ کے سامنے ہوں اس کی خامیاں آپ کے سامنے نہ آئیں۔ متنازعہ شخصیت تو جنرل ضیاءالحق بھی تھے۔ کیونکہ وہ کہا کرتے تھے کہ اس قوم کے ذہن سے جمہوریت کا کیڑا کیوں نہیں نکلتا۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ خوبیوں کے مالک نہیں تھے۔ ان کا حلقہ اثر آج بھی موجود ہے حالانکہ وہ سیاسی طور پر آمر تھے، جمہوریت کے قائل نہیں تھے۔ لیکن ان کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جنہیں لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کو لے لیں، ان میں بھی خامیاں موجود تھیں۔ وہ بھی اپنی طرز کے آمر تھے۔ گو ان کا دور جمہوری آمریت کا دور تھا لیکن اس کے باوجود ان میں خوبیاں بھی تھیں۔ میری نگاہ میں عام انسان شیطان اور فرشتوں کے خصائل کا حامل ہے۔ اس میں نیکی اور بدی کا امتزاج ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ کیونکہ یہ بات شیطان یا فرشتوں میں نہیں۔ شیطان تو بدی ہی کرے گا اور فرشتہ صرف نیکی ہی کرے گا۔ انسان کے پاس کیونکہ انتخاب کا اختیار ہے اس لیے نیک اور بد میں چناؤ کے وقت اس سے بعض غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ یعنی انسان فرشتے اور شیطان کی طرح مکینیکل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں وہ میرے نزدیک کوئی قابل عزت یا قابل تعظیم شخصیت نہیں۔ اس میں خامیاں بھی ہونی چاہیئے ورنہ وہ انسان نہیں ہوتا بلکہ روبوٹ، مشین یا حیوانات، نباتات اور جمادات کے خاندان میں سے ہو گا۔

س:- کیا کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کسی کیس میں ایک مخصوص فیصلہ سوچ رکھا تھا لیکن عین وقت پر آپ نے اسے بدل دیا-

ڈاکٹر جاوید اقبال:- ایسا کبھی نہیں ہوا- لیکن یہ صورت ہے کہ بعض اوقات ایسے فیصلے ہوتے ہیں کہ آخر دم تک انسان تذبذب میں رہتا ہے کہ اسکا فیصلہ کس طریقے سے کیا جائے- ایسے کیس بہت کم ہوتے ہیں- میں بہت جلد فیصلہ کرنے والا جج تھا- میں تو زیادہ فوجداری کے مقدمے کرتا تھا- میری کوشش ہوتی تھی کہ جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں- اور جب میں کسی نتیجے پر پہنچ جاتا تھا تو پھر اس کو بدلتا نہیں تھا- میرے ساتھیوں میں بعض ایسے جج صاحبان بھی تھے جو عموماً تذبذب کے عالم میں رہے- جج کے لیے تذبذب کے عالم میں رہنا بہت بڑی خامی ہے- اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیصلوں میں تاخیر ہو جاتی ہے تاخیری فیصلوں میں آپ واقعات کو بھول جاتے ہیں اور پھر ایسے فیصلوں مین غلطی کا زیادہ امکان ہوتا ہے- تذبذب میں نہیں رہنا چاہیئے-

س:- نظریہ ضرورت آپ کی نظر میں جائز نظریہ ہے اور اس کے پاکستان کی سیاست پر آپ کیا اثرات دیکھتے ہیں-

ڈاکٹر جاوید اقبال:- پہلے تو اس پر غور کیجیئے کہ ہماری روایتی فقہ کیا کہتی ہے- ہماری روایتی فقہ میں نظریہ ضرورت کا بار بار ذکر آتا ہے- مشہور کتب اگر آپ کے مطالعے سے گزریں تو سوائے نظریہ ضرورت کو آپ کچھ نظر نہیں آئے گا- مثلاً تصور آئین اسلامی کے متعلق جو سب سے اہم کتاب ہے وہ احکام السلطانیہ ہے- اس کے مصنف الماوردی تھے جو شافعی عقیدہ رکھتے تھے- اس میں وہ ذکر کرتےہیں امارت استیلا کا یہ کیفیت اس لیے پیدا ہوئی کہ ہماری تاریخ میں خلافت راشدہ کے بعد جمہوری نظام تو تھا نہیں- ایک شخص اٹھتا تھا اگر اس کے پاس طاقت ہے تو وہ بزور شمشیر دوسرے کے ملک پر قابض ہو جاتا تھا- الماوردی نے لکھا ہے کہ جس وقت ایسا غصب ہو تو جو غاصب ہے وہ اگر خلیفہ وقت سے سند لے لے اور وعدہ کرے کہ میں آپ کو یعنی مرکز کو پیسے بھیجتا رہوں گا اور ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کرے کہ میں اسلامی نظام ہی کا انعقاد کروں گا- تو اس بنا پر اس کا غصب شرعی طور پر جائز ہو گا- اب آجائیے حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف---انہوں نے اپنی کتاب حجت اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ شرعی طور پر حکومت بنانے کے تین طریقے ہیں- ایک انتخاب دوسرا نامزدگی اور تیسرا غصب- یعنی غصب

بھی اگر کامیاب ہے تو وہ شرعی طور پر جائز ہو گا بشرطیکہ غاصب یہ اعلان کر دے کہ میں اسلامی قوانین ہی نافذ کروں گا- اب غصب کے تصور کو جو ہمارے ہاں شرعی طور پر جائز قرار دیا گیا ہے یہ ایک طرح سے نظریہ ضرورت ہی تو ہے- اسی نظریہ ضرورت کو قرآنی اصطلاح میں اضطرار کہتے ہیں- اضطرار مجبوری کی صورت کو کہتے ہیں- یعنی ایسے حالات میں ایک چیز جو کہ حرام ہے اس کی بھی اجازت ہو جاتی ہے- اب سوال یہ ہے کہ جس وقت پاکستان بنا تو کیا ہم روایتی فقہ کے اصول کے مطابق چلے ہیں یا کہ ہم نے کوئی مخصوص راستہ نکالا ہے- فرض کیجیئے کہ آج یہاں صورت ہو جاتی ہے جو افغانستان میں ہے- کوئی غاصب آتا ہے جو دہریہ اور کافر ہے وہ یہاں پر اشتراکیت نافذ کرنا چاہتا ہے تو کیا ایسی کیفیت کو بھی نظریہ ضرورت کے تحت اضطرار کی کیفیت سمجھا جائے گا یا نہیں ایسے غاصب کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہے- صرف اسی غاصب کی حکومت شرعاً صحیح قرار دی جا سکتی ہے جو مسلمان ہو اور وعدہ کرے کہ میں اسلامی قوانین کو جاری و ساری رکھوں گا- مگر جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے خیال رہے کہ ہمارا چارٹر قرار داد مقاصد ہے- قرارداد مقاصد میں ان تین شرعی طریقوں میں سے صرف ایک شرعی طریقے کو حکومت بنانے کے لیے تسلیم کیا گیا ہے- اور وہ ہے انتخاب- یہاں جب بھی عسکری آمریت کی صورت پیدا ہوئی ہے تو وہ قرارداد مقاصد سے انحراف ہے- پاکستان میں آدھے سے زیادہ وقت آمریت رہی ہے- خواہ وہ ایوب خاں کی آمریت تھی- یحییٰ خان کی یا ضیاء الحق کی آمریت تھی- آمریت کے ان ادوار میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرارداد مقاصد سے انحراف کیا گیا- یعنی قائداعظم کے نظریات سے ہم انحراف کرتے رہے اور کرتے چلے آ رہے ہیں- خواہ حالات کچھ ہی ہوں، خواہ اس کی ذمہ داری آپ کسی پر بھی ڈالیں لیکن وہ انحراف ہوتا چلا گیا- اس طرح سے بہت سی قباحتیں ہم میں آئیں- ایک وہ زمانہ تھا کہ قائداعظم کی وسیع النظری کے سبب ان کی اپنی کابینہ میں احمدی یا ہندو بھی وزیر تھے لیکن انہیں لیاقت یا میرٹ کی بنیاد پر وزیر رکھا جا سکتا تھا- پاکستان کے چیف جسٹس کارنیلیس عیسائی عقیدے کے تھے- اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جو وسیع النظری پاکستان بننے کے وقت موجود تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی- آمریت کے ادوار کے سبب ہم زیادہ قدامت پسند ہوتے گئے ہیں- قدامت پسندی سے وابستگی تو ہمیں قائداعظم کے

نظریات کے ساتھ رکھنی چاہیئے تھی یا علامہ اقبال کے نظریات کے ساتھ۔ لیکن ہم نے اس کی بجائے علاقہ پرستی کی قدامت پسندی قبول کی۔ یا نسل پرستی یا زبان پرستی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ایک طرح کی قدامت پسندی ہی تو ہے جو سندھ میں حالت ہے۔ کہ ہم لسانی اور نسلی طور پر بٹے ہوئے ہیں اور بٹتے چلے جا رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اتحاد کی صورت ہو یا ہم آہنگی کی صورت ہو۔ قائداعظم کے رستے سے ہٹ کر ہم منتشر ہوتے چلے گئے ہیں۔۔۔۔ اس کی وجہ بار بار مارشل لاء کا لگنا ہے۔ کیونکہ جب رواداری ختم ہو جائے تو ایک دوسرے کے لیے نفرت و حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رہتا۔ ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس طرح سارا معاشرہ ابتری کا شکار ہو جائے گا۔ گروہوں میں بٹ جائے گا۔ یہی کیفیت اس وقت ہماری ہے۔ جس وقت ایسی صورت ہو اور بار بار مارشل لاء لگے تو سرے سے عدلیہ ہی فارغ ہو جائے گی۔ ہم سنتے چلے آئے ہیں کبھی یہ کہا جاتا رہا کہ ہم یہاں پر عوامی عدالتیں بنائیں گے۔ کبھی یہ کہا گیا کہ اسلامی عدالتیں قائم کریں گے۔ ہمارے اکثر قائدین اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ بہتری کی ایک ہی صورت ہے کہ ملک کے سیاسی حالات ٹھیک کئے جائیں تاکہ یہاں پر جمہوریت فروغ پائے۔ اسی میں عدلیہ کا وقار بھی ہے اور اس کے پاس اختیار بھی رہتا ہے۔ جمہوریت چلتی ہے آئین کے تحت۔ اور عدلیہ آئین کی پیداوار ہے۔ آئین کے تحت ہی عدلیہ کے اختیارات برقرار رہتے ہیں۔ جب جمہوریت کا خاتمہ ہوتا ہے، آئین معطل ہو جاتا ہے جب آئین معطل ہوتا ہے تو عدلیہ اپنا تسلسل قائم نہیں رکھ سکتی۔ اگر آپ عملی طور پر سوچیں تو نظریہ ضرورت کی حقیقت کو اسی طرح بطور حقیقت تسلیم کرنا پڑے گا جس طرح غصب کی حقیقت کو ہمارے پرانے فقہا نے نظریہ ضرورت کے تحت قبول کیا ہے۔ یہ ایک عملی انداز فکر ہے لیکن دوسرا تخیلی انداز فکر ہے۔ تخیلی انداز فکر میں تو آپ کہیں گے کہ ٹھیک ہے آپ استعفیٰ دے کے آجائیں۔ ہر مرتبہ آپ اسی طرح ججوں سے استعفیٰ دلوائیں گے تو ملک سے عدلیہ تو ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اسکے قیام کا انحصار تو آئینی تسلسل پر ہے۔

س:۔ آپ سول کے بجائے اپنی طبیعت کے خلاف فوجداری جج کیوں بنے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ایک طرح سے میری طبیعت کے خلاف

تھا۔ اصل میں جس وقت میں وکالت کرتا تھا اور ہمارے ہاں عموماً جو وکلاء ہیں وہ دو تین قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو ایک خاص رخ اختیار کر لیتے ہیں مثلاً صرف فوجداری کام کرتے ہیں۔ دوسرے کیس نہیں لیتے۔ ایک وہ ہیں جو صرف کمپنیوں کا کمرشل کام کرتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو صرف سول کام کرتے ہیں۔ جس زمانے میں، میں نے وکالت شروع کی، اس زمانے میں وکیل ہر قسم کے کام کر سکتا تھا۔ میں نے دس بارہ برس پریکٹس کی میں نے کوئی خاص رخ متعین نہیں کیا۔ میں تو ہر قسم کے کیس لے لیا کرتا تھا۔ جس وقت میں جج بنا ہوں تو جج کے لیے بھی ابتدا میں یہ طریقہ ہوتا ہے کہ جو نئے جج بنیں ان کو مختلف بنچوں پر بٹھاتے ہیں تاکہ وہ ہر قسم کا کام سمجھ جائے۔ ابتدائی دو ڈھائی سال میں مختلف شعبوں میں کام کرتا رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی مخصوص رستہ میرے لیے تھا۔ لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ انوارالحق صاحب کے زمانے میں مجھے زیادہ فوجداری بنچوں پر بیٹھنے کے مواقع دیئے گئے۔ شاید وہ مجھے اس لیے سوٹ کیا کہ فوجداری مقدمات میں واقعات کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور واقعات کے ساتھ جلد فیصلہ کر لینا نسبتاً آسان ہے سول کیسوں کے مقابلے میں اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ مجھے فوجداری مقدمات میں اس لیے بھی دلچسپی ہے کیونکہ میں بنیادی طور پر مصنف ہوں۔ گو میری دلچسپی فلسفے اور سیاست میں بھی ہے۔ مدت تک میں ڈرامہ نگار بھی رہا ہوں۔ اور اب بھی موقع ملے تو میں اس صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ مجھے فوجداری پہلو اسلیے بھی اپیل کیا ہے کہ اس میں انسانی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور اس میں ہر کیس ایک حکایت ہوتی ہے۔ ایک داستان ہوتی ہے ایک افسانہ ہوتا ہے جس کا ایک ڈرامائی پہلو ہے۔ یعنی انسانی جذبات کا ایک تصادم ہوتا ہے۔ جس وقت بھی کوئی کسی کو قتل کرتا ہے وہ نارمل حالات تو نہیں ہوتے۔ اس میں اس کے ذہن کی ساخت اور پھر کمزوریاں سارا کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک اعتبار سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا اس طرف رجحان اس لیے زیادہ ہوا کیونکہ میری طبیعت میں ڈرامائی اور افسانوی انداز فکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فوجداری جج وہی ہو سکتا ہے جس کی وسعت نظر ہو۔ اس کی سوچ میں تنگ نظری نہ ہو۔ وہ چشم پوشی کرنا جانتا ہو انسانی کمزوریوں کی بجائے اس کے کہ وہ اتنا غصہ کرے کہ آدمی کو پھانسی پر لٹکا دے۔ میرے زمانے کے جو چیف جسٹس صاحبان تھے۔ انہوں نے شاید میرے

بارے میں یہی محسوس کیا کہ میں اس شعبہ میں بہتر خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ کیونکہ بطور جج کے بھی میری عام شہرت یہ تھی کہ بری کر دینے والا جج ہے۔ یعنی جو سنگین نوعیت کے مقدمات ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں اگر اس کے ذہن میں ذرا بھی شک یا شبہ پیدا ہو جائے تو یہ بری کر دیتا ہے۔ میری حتی الوسع کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی انسانی زندگی کو جب تک وہ بہت ہی ضروری نہ ہو۔ اس کو ختم نہیں کیا جانا چاہئیے۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ اس شدید سزا سے کسی نہ کسی طرح مجرم کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

1973ء میں جاوید اقبال لاہور ہائی کورٹ کے مستقل جج کی حیثیت سے اوتھ لے رہے ہیں انہیں چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے اوتھ دی تھی۔

س:۔ آپ نے کتنے مجرموں کو پھانسی کی سزا دی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ میں نے پانچ فیصد مجرموں کو پھانسی کا حکم سنایا ہو گا۔ ہم میں سے بعض جج صاحبان تو قصائی مشہور تھے۔ جن کے متعلق عام تاثر یہ تھا کہ سخت گیر اور سفاک ہیں جس وقت پھانسی لگ رہی ہوتی ہے اس وقت موقع پر جج موجود نہیں ہوتا۔ جج جس وقت یہ سزا سنا رہا ہوتا ہے اس کو یہ سوچنا چاہئیے کہ جس وقت اس سزا پر عمل

درآمد ہو گا تو اس وقت مجرم کی کیا کیفیت ہو گی۔ یعنی اسے احساس ہونا چاہئیے کہ پھانسی لگنے کی تکلیف کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں دیدہ دانستہ فوجداری مقدمات کی طرف نہیں آیا۔

س:۔ آپ نے اپنے ان تجربات کو افسانوں یا ڈراموں میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ نہیں۔ وہ اس لیے کہ ہمارے بعض کیسز جو میرے تجربے میں سے گزرے ہیں ان کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کے متعلق ٹی وی کی پالیسی مختلف ہے۔ ہمارے ٹیلی وژن میں اس قسم کے واقعات دکھانے سے گریز کیا جاتا ہے جس میں تشدد ہو۔ اس لیے بات بن نہ سکی۔ اگر انہیں اسٹیج پر لانے کی کوشش کی جائے تو اس کے امکانات بھی مجھے فی الحال کم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں ابھی تک ایسا تھیئٹر نہیں بنا جس میں کوئی سنجیدہ پیش کش کی جا سکے۔ زیادہ تر جو ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں وہ ایک طرح کا بھانڈوں کا کھیل ہی ہوتا ہے۔ جس میں ہنسی مذاق اور ٹھٹھا ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ اخلاقی سطح سے بھی گر جاتے ہیں۔ جو ڈرامہ دیکھنے جاتے ہیں ان میں ابھی یہ ذوق پیدا نہیں ہوا کہ وہ سنجیدہ ڈرامہ دیکھیں۔ البتہ یورپ میں ڈراما نگاری کی یہ صورت ہے کہ وہاں ایسے ایسے ڈرامے لکھے گئے کہ ان کے ذریعے قوموں کے نظریات بدل دئیے گئے۔ اس طرح وہ معاشرے میں تمدنی انقلاب لے آئے۔ اس میں سب سے زیادہ مشہور نام ابسن کا ہے اس نے ایسے ڈرامے لکھے کہ جدید یورپ کا انداز فکر بدل گیا اور شمالی یورپ کا تمدن بھی بدل گیا۔ یہاں بھی اس قسم کے ڈراموں کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں پر اس قسم کے ڈرامے پیش نہیں کئے جا سکتے۔ سٹیج کا وہ ماحول نہیں اور ٹیلی وژن کی اپنی مجبوریاں ہیں۔

س:۔ کیا آپ نے اس قسم کی تجربات پر مشتمل کوئی کتاب لکھ رکھی ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ نہیں۔ البتہ ایک ہندو جج نے اس قسم کی کتاب لکھی ہے کہ اس کے زمانے میں کون کون سے مقدمات پیش ہوئے۔ وہ افسانوی رنگ میں نہیں ہے۔ وہ ایک طرح سے مضمون نگاری ہے۔ کہ فلاں مقدمہ تھا اس میں میں نے ان واقعات کی بنا پر یہ فیصلہ دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اپوا میں، میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ "پاکستان میں عورتوں کے خلاف جرائم" اس میں کچھ واقعات میں نے ان کیسز کے دئیے تھے جو میرے سامنے آئے۔ پنجاب کے بعض اضلاع میں کسی

دشمن کو قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو بچانے کے لیے کاراکاری کی دفاع استعمال کی جاتی ہے۔ کاراکاری سے مراد یہ ہے کہ ملزم اپنی کسی خاتون قریبی رشتہ دار کو کسی نامحرم کے ساتھ مشکوک حالت میں دیکھ کر اس عورت اور اس کے ساتھی کو قتل کر دیتا ہے یعنی دونوں کو قتل کرنے کے بعد پولیس میں چلا جاتا ہے۔ ضابطۂ فوجداری کے تحت ایسے شخص کو تھوڑی مدت کی قید کی سزا ہوتی ہے۔ اس کی ضمانت بھی ہو جاتی ہے۔ اس طریق کار کا بعض لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً میرے مشاہدے میں ایک کیس ایسا آیا کہ ایک شخص نے دشمن کو مارنا تھا۔ اس نے اسے مار کر نعش کو جنگل میں کہیں چھپا دیا۔ اب اس نے اپنا دفاع کرنا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی ایک اندھی بیٹی تھی جس کی عمر تقریباً 14 برس تھی۔ وہ ایک طرح سے معذور تھی۔ نہ اس کی شادی ہو سکتی تھی نہ وہ گھر کا کام کاج کر سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کو ختم کر دو۔ اس نے بچی پر بندوق سے فائر کیا۔ بچی تو مر گئی مگر اس کے چھرے ساتھ کھڑے اس کی بھینس کو لگ گئے۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس بچی کو اٹھا کر لے جائے گا اور اپنے دشمن کے ساتھ ننگا کر کے لٹا دے گا اور بعد میں یہ کہے گا کہ یہ میری اندھی بیٹی کے ساتھ خراب تھا۔ میں نے اپنی بیٹی کو مار دیا اور اسے بھی مار دیا۔ اس نے سوچا کہ تین چار ماہ جیل میں رہوں گا۔ پھر رہا ہو کے آجاؤں گا۔ اس وقوعہ میں بیٹی کو تو اس نے مار دیا۔ لیکن اس نے بھینس کو دیکھنے میں زیادہ وقت ضائع کر دیا۔ اس کے نزدیک اندھی بیٹی سے کہیں زیادہ ایک دودھ دینے والی بھینس کی اہمیت تھی۔ اتنے میں اور لوگ آ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ وقوعہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ میرے سامنے اس شخص کا مقدمہ آیا اور میں نے اس شخص کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ آپ اندازہ کر لیں۔ اس کیس میں کتنا ڈرامائی پہلو ہے۔ لیکن ایسا ڈراما ہمارے ٹی وی پر نہیں دکھایا جا سکتا ایسے کیسز میرے سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی واقعات ہیں۔ جن کا ذکر میں نے اپنے اپوا والے مقالے میں کیا تھا۔

س:۔ آپ نے فرمایا ہے کہ آپ پھانسی کی سزا بہت کم دیا کرتے تھے۔ آپ کے سامنے ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ ہے۔ اس دور میں آپ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ اس بنچ میں ہوتے جس نے بھٹو کے خلاف قتل کیس کی سماعت کی تو آپ کا فیصلہ مختلف ہوتا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔ اول تو میں اس بنچ میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو واقعات کے مطابق ہی نظریہ قائم کیا جاتا آپ کو علم ہے کہ اس کیس میں سپریم کورٹ کے ججوں میں آپس میں اختلاف تھا۔ بعض جج سمجھتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا نظریہ ان کی بریت کے متعلق تھا۔ لیکن دوسرے جج صاحبان کا نظریہ مختلف تھا۔ یعنی تین اور چار کا فرق تھا۔ جب ایسا فرق ہو تو فیصلہ اکثریت ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عدلیہ اس فیصلے میں آزاد نہیں تھی۔ سات ججوں میں سے تین نے اختلافی نوٹ لکھے پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ عدلیہ آزاد نہیں تھی۔ اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت عدلیہ نے جو فیصلہ کیا تھا وہ مارشل لاء کے دباؤ میں کیا تھا۔ اگر دباؤ ہوتا تو سبھی جج ایک جیسا یعنی متفقہ فیصلہ کرتے۔ سپریم کورٹ میں جسٹس محمد حلیم صاحب نے اکثریتی ججوں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اختلافی نوٹ دیا تھا اور بعد میں مارشل لاء کے دور ہی میں وہی چیف جسٹس بھی بنے۔ تو آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ فیصلہ دباؤ کے تحت تھا۔ فرض کیجیے کہ میں اس بنچ میں ہوتا اور اختلافی نوٹ تحریر کرتا تو اکثریت کا جو فیصلہ ہونا تھا، عمل درآمد تو اسی پر ہوتا۔ اس قسم کے مقدمات میں سب سے زیادہ اہمیت واقعات کو دی جاتی ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ نے کسی شخص کو خود قتل کیا یا کسی اور کے ذریعے قتل کروایا۔ جو اجرتی قاتل ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی کا قتل کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کو کوئی نہ کوئی اجرت دے رہا ہے سو اس جرم میں اجرت دینے والے کی پوزیشن کیا ہو گی؟ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ موقع پر موجود نہ تھا۔ اجرتی قاتل تو اجرت لے کر قتل کرے گا وہ تو ممکن ہے قاتل کو جانتا بھی نہ ہو۔ اور اس کے پاس صرف مقتول کی تصویر ہو۔ پس وہ اپنا کام کر دے گا اور جا کے اجرت لے لے گا۔ اس ضمن میں صرف اجرتی قاتل ہی نہیں بلکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے اجرت دینے والے کے ایما پر قتل کیا ہے تو اجرت دینے اور لینے والے دونوں کی ایک ہی پوزیشن ہو گی۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ قتل کرنے والا موقع پر کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ ہی سے پستول یا تلوار چلائے۔ ہر کیس کے واقعات اپنی نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس کے مطابق ہی فیصلہ کیا جاتا ہے۔

س:۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اسلامی سزاؤں کا تو ذکر کیا جاتا ہے لیکن اسلامی برکات کا

ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں تفصیل سے کچھ بتائیے۔
ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ اس بحث کو میں نے اپنے کئی مقالوں میں اٹھایا ہے۔ ہم نے اور ہمارے علماء کرام نے دعویٰ تو ہمیشہ یہ کیا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک اقتصادی اور معاشی نظام ہے۔ یعنی اس کے تحت ہر ایک کو کم از کم بنیادی ضروریات میسر ہو سکتی ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل علامہ اقبال کے جو خطوط قائداعظم کے نام تھے، ان میں بھی علامہ نے ذکر کیا ہوا ہے کہ پاکستان میں ایک ایسی سوشل ڈیماکریسی قائم کی جانی چاہیئے جسے شریعت اسلامی کی تائید حاصل ہو۔ لیکن علامہ کی نگاہ میں شریعت کی تعریف کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ شریعت قدیم فقہا کے استدلالات کا مجموعہ ہے۔ جس کو کسی صورت میں بھی حرف آخر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ قدیم فقہا کا استدلال ان کے اپنے اپنے وقت میں تو درست تھا لیکن آج کے حالات بدل چکے ہیں اس لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ وہ معاشی پہلو پر بھی اجتہاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے بعض اشعار میں بھی کیا ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ ممکن ہے اس دور میں قرآن مجید کا جو "قُلِ العفو" کا تصور ہے اس کی تشریح ہماری سمجھ میں آجائے۔ "قُلِ العفو" سے مراد یہ ہے کہ تمہارے پاس جو بھی تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے وہ ملت کی فلاح و بہبود کے لیے دے دیا جائے۔ علامہ کا شعر ہے۔

جو حرف "قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

علامہ اقبال کی نگاہ میں اسلامی سزاؤں سے کہیں زیادہ اسلامی برکات کی اہمیت ہے۔ سزائیں نافذ کرنے میں وہی اسلامی حکومت حق بجانب ہو گی جو پہلے ہمیں اسلامی برکات سے بہرہ مند کرے اگر ہمیں اسلام کی برکات ہی میسر نہیں تو پھر کسی مسلم ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سزاؤں کا سختی سے انعقاد کرے۔ یہ بات علامہ کے ذہن میں تھی۔ اسی لیے انہوں نے شاہ ولی اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ سزائیں مقصود بالذات نہیں۔ اس وقت دنیا کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ مارکسی اور سرمایہ دارانہ نظام بیسویں صدی کی ابتدا میں عالمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مثالی نظام سمجھے جاتے تھے۔
اب ہم بیسویں صدی کے اختتام تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ دونوں نظام عالمی طور پر

پسماندگی دور کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس وقت جو ترقی یافتہ اقوام ہیں ان میں کسی کے پاس بھی کوئی ایسی معاشی تنظیم نہیں ہے جو انسان کے لیے مستقبل میں اپنی زندگی کو آسودہ بنانے کے لیے نیا عزم پیدا کر سکے۔ دنیا کو اس وقت ایک نئے عالمی معاشی نظام کی ضرورت ہے۔ سب سے اہم مسئلہ جو علماء کرام کے سامنے ہونا چاہیئے وہ تو یہی ہے کہ صاحب ہم جس نظام کا بار بار ذکر کرتے ہیں یعنی اسلام کی برکات کا ذکر کرتے ہیں تو اسلام کا جو معاشی نظام ہے۔ کم از کم اس کو تو پیش کریں۔ اگر مسلمانوں کا معاشی مسئلہ حل نہ کیا گیا تو اس ملک میں جس طرح جمہوریت کا مستقبل مخدوش ہے اسی طرح اسلام کو بھی یہ سب سے بڑا چیلنج درپیش ہو گا۔ یہ مسئلہ حل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ ہم نہ تو اب مارکسی نظام پر انحصار کر سکتے ہیں جو پاش پاش ہو رہا ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام پسماندگی کو دور کر سکتا ہے جس طرح کہ اس کی استحصالی شکل اس وقت نظر آتی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ پسماندگی ہے۔ اگر ہمارے دانشور اور علماء اس مسئلہ کا حل پیش نہیں کر سکتے تو پھر ہم کن معنوں میں اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہے ہیں؟
س:۔ آپ نے فرمایا ہے کہ پاکستان کی آدھی سے زیادہ زندگی آمریت کے تحت گزری۔ پروفیسر مرزا محمد منور صاحب نے آپ کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا جس میں آپ نے فرمایا کہ پاکستان میں اچھے کام آمریت ہی کے دور میں ہوئے۔ مثلاً مینار پاکستان ایک فوجی جرنیل ایوب خان کے دور میں بنا اور ایوان اقبال بھی ایک فوجی بزرگوار ضیاءالحق کے دور میں بنا۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے۔
ڈاکٹر جاوید اقبال:۔ یہ بات ایک اعتبار سے درست ہے۔ کیونکہ آمر کو یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے نہ صرف قومی مفاد وابستہ ہو بلکہ وہ اسلام کے زمرے میں بھی آتا ہو۔ کیونکہ ایسا عمل اس کی آمریت کو استحکام دیتا ہے۔ اس لیے ضیاءالحق نے اگر ایوان اقبال کی بنیاد رکھی اور اقبال میوزیم بنوایا تو یہ بھی ایک طرح سے ایسا قومی کام تھا جو پہلی جمہوری حکومتوں نے نہیں کیا تھا۔ اسی طرح اگر مینار پاکستان ایوب خان کے زمانے میں بنا تو یہ بھی ایسا قومی کام تھا جو ان سے پہلے کی جمہوری حکومتوں نے نہیں کیا۔ یہ ایسا کام تھا جو قیام پاکستان کے فوراً بعد ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن نہ ہوا اور آمریت کے ادوار میں کیا گیا۔

جوڈیشری کا جہاں تک تعلق ہے اس پر انتظامیہ ہی حاوی رہی۔ آج تک جوڈیشری کی ایسی صورت نہیں ہوئی کہ وہ انتظامیہ کے چنگل سے نکل سکے۔ صرف پاکستان بننے کے بعد پہلے گیارہ برس آپ کہہ سکتے ہیں کہ جوڈیشری صحیح معنوں میں باوقار تھی۔

جب میں بطور جج کنفرم ہوا اس وقت چیف جسٹس سردار اقبال تھے۔ سردار صاحب کو ایک خصوصی قانون بنا کر فارغ کر دیا گیا۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ چیف جج کون مقرر ہو۔ یہ سلیکشن پوسٹ ہے۔ نمبر دو مولوی مشتاق تھے لیکن انہیں نہ بنایا گیا۔ بھٹو کے ذہن میں میرا نام تھا حالانکہ میرا اس وقت 14 واں نمبر تھا۔ میں نے ان کو اطلاع پہنچائی کہ مجھ سے سینئر 14 جج ہیں لہٰذا میں چیف جج نہیں بننا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ میں جہاں ہوں، وہیں رہوں۔ پھر جناب جسٹس اسلم ریاض چیف جسٹس بنے۔ ان کا آٹھواں نمبر تھا۔

اس دور میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ بھارتی حکومت نے علامہ اقبال کا صد سالہ جشن ولادت منانے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں وہاں اندرا گاندھی کی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی بھٹو صاحب کے زیر صدارت ایک نیشنل کمیٹی بنائی گئی تاکہ یہاں جشن ولادت اقبال منایا جا سکے۔ یہ جشن 1977ء میں منایا گیا۔

جب بھٹو صاحب کے ساتھ انتخابات میں میرا مقابلہ ہوا تو اس سے بیشتر میں نے داتا گنج بخش اور علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں یہ عرض کی کہ میں ذاتی اقتدار کے لیے الیکشن نہیں لڑ رہا بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی اساس خطرے میں ہے اس کا تحفظ کیا جائے کیونکہ ان دنوں عوامی لیگ کے چھ نکات کا زور شور تھا۔ معلوم یہ ہو رہا تھا کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں بے اعتمادی کی فضا ہے اور ممکن ہے کہ ملک ٹوٹ جائے اس پس منظر میں یہی دعا کی کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس ملک کی اساس کو بچانے کے لیے کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں تو مجھے موقع ملنا چاہیے اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر سکتا تو میں اگر ناکام بھی ہوا تو مجھے اس کا رنج نہیں ہو گا۔ یہ پس منظر تھا جس کے تحت میں نے انتخابات میں حصہ لیا۔

جس وقت الیکشن ختم ہو گئے اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ میں نے شکست کے بعد یہ محسوس کیا کہ شاید میں ملک میں کوئی سیاسی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ بھٹو

صاحب کو یہ احساس رہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے اس بات کا ازالہ کریں۔ میں نے جو ان کے مقابلے میں شکست کھائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آغا شورش کاشمیری کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں تو میں نے آغا شورش کاشمیری کو ایک شعر سنایا تھا اور کہا کہ یہ شعر بھٹو صاحب کو سناؤں۔ یہ شعر علامہ اقبال کا "شکوہ" میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

میں سمجھتا ہوں ہر چیز میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ الیکشن میں ناکامی کے بعد میں عدلیہ میں شامل ہو گیا اور پھر وہ وقت آیا جب بھٹو صاحب پر قتل کا کیس چلا۔ جب لاہور ہائی کورٹ میں یہ کیس زیر سماعت تھا تو مولوی مشتاق حسین چیف جسٹس تھے۔ مولوی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اس بنچ میں بیٹھو۔ میں نے جواب دیا کہ اس مقدمے میں بھٹو صاحب کے خلاف قتل کا کیس ہے اور پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

میں اس لیے اس بنچ میں بیٹھنا نہیں چاہتا کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ مجھے انہوں نے الیکشن میں ہرایا تھا اور میں اب انہیں موت تک کی سزا سنا سکتا ہوں۔ میرا جواب سن کر مولوی صاحب نے مجھے مجبور نہ کیا اور میں اس بنچ میں نہ بیٹھا۔

میں نے اس موقع پر جاوید اقبال صاحب سے پوچھا اگر آپ اس بنچ پر بیٹھتے تو اس کیس میں آپ کا فیصلہ کیا ہوتا؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا فیصلہ کیا ہوتا البتہ بہتر ہوتا کہ اس کیس کو عدلیہ میں لانے کے بجائے مارشل لاء کی عدالت سنتی۔ مارشل لاء کے دور میں اس کیس کے عدلیہ میں سنے جانے کے سبب عدلیہ کے وقار کو نقصان پہنچا اور بیرونی دنیا میں یہ تاثر قائم ہوا کہ پاکستان کی عدلیہ آزاد نہیں ہے۔

خیر میں سمجھتا ہوں کہ خدا کی مصلحت مجھے الیکشن میں ہرانے پر یہی تھی کہ بھٹو کے مقدمہ قتل کے بنچ پر میرے نہ بیٹھنے کا نہایت مستحکم جواز مجھے مل جائے۔

اس میں ایک اور بھی بات دلچسپ ہے جس کا ذکر کرتا چلوں۔ جس روز بھٹو

صاحب کو پھانسی ہونا تھی اس روز اتفاق سے ایک کھانے پر ایسی شخصیات بھی موجود تھیں جن کو علم تھا کہ صبح تین بجے بھٹو صاحب کو سزا دے دی جائے گی۔ وہاں ان کی پھانسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

یہ چار اپریل کی رات تھی میں کھانے سے واپس آیا رات جب سویا میرے اوپر سفید چادر تھی۔ رات تین بجے کے قریب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بھٹو صاحب آئے ہیں انہوں نے میرے اوپر سے چادر اتار کر دور پھینک دی ہے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ان کا صرف ایک انگریزی کا جملہ سنائی دیا جو یہ تھا۔ "جاوید اقبال ---! یہ دیکھو میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں"۔ شاید رات کھانے میں جو باتیں ہو رہی تھیں اس کا اثر تھا کہ میں نے اس قسم کا خواب دیکھا۔

بہر کیف اس قسم کے واقعات کا ذکر بے نظیر صاحبہ نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے کہ ان کے بعض جاننے والوں کو یہ تجربہ ہوا۔ تو میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں کہ میرے ساتھ واقعی اس قسم کا تجربہ ہوا حالانکہ میری بھٹو صاحب سے کوئی اتنی قربت نہیں تھی۔

اہم شخصیات سے ملاقاتیں

1943ء میں جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا تو فکری اور روحانی طور پر چودھری محمد حسین کے زیر اثر آیا۔ ان کی وساطت سے مجھ میں تعلیمات اقبال کو سمجھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ گویا وہ میرے لیے خزینہ اقبال کی کلید ثابت ہوئے یا ان کی رہبری میں میرے سفر در اقبال کی ابتدا ہوئی۔ اس رشتہ کا روحانی پہلو اس قدر لطیف ہے کہ اسے الفاظ کے احاطہ میں نہیں لایا جا سکتا۔

ستمبر 1949ء میں میں تحصیل علم کی خاطر انگلستان گیا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں پانچ سال قیام کے دوران میں پروفیسر آربری اور پروفیسر روبن لیوی کی زیر نگرانی تحقیق کا کام کرتا رہا۔ لیکن ان ہر دو نامور شخصیتوں سے کسی قسم کی قربت کا رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ اسی وجہ سے جولائی 1950ء میں جب مجھے کیمبرج میں چودھری محمد حسین کی وفات کی خبر ملی تو بیقرار ہو گیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقعہ تھا جب میں نے اپنے آپ کو فکری اور روحانی اعتبار سے قطعی طور پر تنہا محسوس کیا۔ یہ احساس کئی دنوں تک میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ ایک چپ سی لگ گئی گویا مجھے کسی نے اچانک خلائے بسیط میں معلق کر دیا ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر میں نے اپنے آپ کو تمدن انگلیسیہ میں گم کرنا چاہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرے انگریز شناسا مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ تم نے تو ہمارے تمدن کو یوں اپنا لیا ہے جیسے پیدا ہی یہیں ہوئے تھے۔ مگر انہیں یہ علم نہیں تھا کہ میں ان کے درمیان اپنے آپ کو بنیادی طور پر ہمیشہ اجنبی محسوس کرتا رہا ہوں۔

کیمبرج سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لندن کا رخ کیا اور دو سال وہاں بیرسٹری کے امتحانات کی تکمیل میں گزر گئے۔ پاکستان لوٹا تو میں نے وکالت شروع کی کیونکہ میری دسترس میں یہی ایک ہنر تھا جس کے ذریعہ آزادی سے اپنی روزی کما سکتا تھا۔ میری کیفیت دراصل ایک ایسے متلاشی جیسی تھی جو لق ودق صحرا میں کوئی حلقہ محرماں ڈھونڈ رہا ہو۔ اسی سلسلہ میں پاکستان کے اکثر و بیشتر سیاسی و معاشرتی رہنماؤں

ے بھی ملا۔ لیکن کوئی نگاہ میں جچتا نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا عشق، فقر، جرات اور حریت ایسی قدریں اس ملک سے عنقا ہو چکی ہیں۔

البتہ سردار عبد الرب نشتر کی صحبت میں بیٹھ کر گونہ تسکین ہوئی۔ 1949ء میں جب میں انگلستان جا رہا تھا تو سردار صاحب مغربی پنجاب کی گورنری کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے مجھے بلوا بھیجا اور نہایت خلوص سے نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات 1957ء میں ہوئی جب کہ کراچی میں مجھے یوم اقبال کے موقعہ پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ آپ صرف میرا مقالہ سننے کی خاطر جلسہ میں تشریف لائے۔ کچھ عرصہ بعد آپ لاہور آئے اور مجھے پھر بلوا بھیجا۔ ان دنوں سپریم کورٹ کے روبرو ایک آئینی قضیے کی سماعت ہونے والی تھی جس میں آپ صوبائی گورنر کے کسی غیر آئینی اقدام کے خلاف مسلم لیگ کی طرف سے بذات خود بحث کے لیے پیش ہو رہے تھے۔ چونکہ مقدمہ کی سماعت مری میں ہونی تھی آپ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مقدمہ چلتا رہا لیکن میری شامیں انہی کی معیت میں سیاسیات پاکستان پر بحث کرتے گزرتی تھیں۔ میں نے سردار صاحب سے التماس کی کہ مسلم لیگ کی تنظیم از سر نو کی جانی چاہیے کیونکہ اس کے آئین میں بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ ایک ایسے سپہ سالار کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ جو میدان کارزار میں تن تنہا گھوڑے پر سوار دشمن پر وار پہ وار کیے جا رہا ہو مگر جس کے اپنے ساتھی اس کی پس پشت اسی دشمن سے ساز باز کر رہے ہوں۔

جب میں اپنے گرد و پیش سے بہت زیادہ بیزار ہو جاتا تو کراچی پہنچ کر محترمہ فاطمہ جناح کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان سے پاکستان کا کوئی بھی سیاسی رستم چھپا ہوا نہیں تھا۔ لیکن وہ افلاک کی سی خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

انقلابی حکومت سے تعاون کے دوران میں تین مرتبہ اقوام متحدہ اور ایک مرتبہ چین بھیجا گیا۔ آسٹریلیا، میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومتوں کی دعوتوں پر ان ممالک کے تعلیمی اداروں میں اسلامی، آئین، تمدن اسلام یا اقوام متحدہ کے مستقبل کے موضوعات پر خطبات دیئے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور ترکی کی یونیورسٹیوں میں پاکستان کے تصور پر تقریریں کرتا رہا۔ 1960ء سے لے کر 1963ء تک میرا وقت

1961ء میں صدر سکارنو مرحوم کے ساتھ جاوید اقبال کی ملاقات

جاوید اقبال بن بیلا کے ساتھ

کبھی وطن میں اور کبھی وطن سے باہر گزرا۔ مگر تنہائی اور نامحرمی کی کیفیت بدستور طاری رہی۔

ستمبر 1964ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا اور چند ہفتوں کے بعد آپ لاہور تشریف لائیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مبارکباد پیش کی آخرکار ان کا دل پسیجا ہے۔ میں نے نہایت عجز سے انہیں اپنی خدمات پیش کیں اور اسی شام ان ہی کے حکم کے مطابق قائداعظم اور علامہ اقبال کی مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھ پر علامہ کی سیرت اور تعلیمات کا اثر نہ ہوتا تو صدارتی انتخاب کی کشمکش میں مادر ملت کا ساتھ دینے کی سعادت سے محروم رہ جاتا۔ میرے لیے یہ عمل فطری تھا کیونکہ مجھے تربیت ہی ایسی ملی ہے۔ جہاں کہیں بھی عشق، فقر، جرات اور حریت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

اسی رات کوئی دو بجے کے قریب میں علامہ کے مزار پر پہنچا اور ان سے عرض کیا "آپ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ میرا دل پتھر کا ہے، میں بڑا سنگدل ہوں۔ میں صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ میں بے حس نہیں ہوں"

ہم اس ملک کی حالیہ سیاسی تاریخ کے بے حد قریب ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے یہ اندازہ لگا سکنا نہایت مشکل ہے کہ مادر ملت نے اس صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر کس نوع کی ملی خدمت انجام دی ہے۔

ہماری ملی سیرت نے ابھی فقر کی سان چڑھنا ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر جو کردار پیش نظر ہے اسے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس سلسلہ میں میرا ذاتی تجربہ خاصا سبق آموز ہے۔ انقلابی حکومت کے ساتھ تعاون کے مختصر سے دور میں مجھے جو بڑا آدمی، بھی ملا اس کے علامہ کے ساتھ ذاتی مراسم رہ چکے تھے اور وہ میرا بڑا مداح تھا۔ لیکن جب میں نے مادر ملت کا ساتھ دیا تو یکایک یہ بڑے آدمی، مجھ سے نظریں چرانے لگے۔ گویا ان کا نہ تو علامہ سے کوئی تعلق تھا، نہ میرے ساتھ کوئی واسطہ۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم ؟

اب مجھے اگر "شکم" کی بجائے، دل کی آزادی قبول ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ آخر یہ کس کی سیرت، کس کی تعلیمات اور کس کی تربیت کا اثر ہے ؟

اس نفسانفسی کے عالم میں چند اور عظیم شخصیتوں سے قرب کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا۔ میں نے جسٹس کیانی کی سیرت میں ان میں صفات اربعہ کا پر تو دیکھا۔ ان کی دلیرانہ حق گوئی سے اس ملک کا ہر باضمیر شخص متاثر ہوا۔ انہوںؒ نے نہایت ہی نازک دور میں نہ صرف عدلیہ کی ضمیر برداری، وقار اور آزادی کے تحفظ کا بیڑہ اٹھایا بلکہ اپنے عمل سے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کسی اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔

اسی طرح حمید نظامی نے بھی تند و تیز ہوا کے باوجود آزادی فکر و تحریر کا چراغ جلائے رکھا اور اس ملک کی صحافت میں ایک ایسی مثال قائم کی جس پر "نوائے وقت" جس قدر فخر کرے کم ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستان میں ایسی جرات مند اور آزاد شخصیتیں خال خال پیدا ہوتی ہیں۔ بہر حال یہی وہ چند ہستیاں ہیں جنہیں میں نے حلقہ محرماں یا حلقہ اقبال سے وابستہ پایا۔ اور جن کی تلاش و جستجو میں سرگردان رہنا۔ علامہ کی سیرت و تربیت کے طفیل، ابتداہی سے میری فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔

طریقہ اقبالیہ کیا ہے؟ یہی کہ عشق، فقر، جرات اور حریت ایسی صفات کو ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنائیں تاکہ ان قدروں کو ہم ملک کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی شعبوں میں منعکس کر سکیں۔ یہی فلسفہ خودی ہے اور اسی کو سلسلہ اقبالیہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسی تربیت جو ہمارے سیاسی اور معاشری ماحول کو صالح اور پاکیزہ بنانے کی بجائے ہمیں بے ضمیری، چاپلوسی اور غلامی کی ترغیب دے، ہمیں کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔

علامہ کی سیرت و شخصیت سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ اگر حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکنے کی جرات ہے تو زندگی آزاد اور بامعنی ہے۔ ورنہ زندگی فقط موت کے انتظار کا نام ہے۔ اسی بنا پر آزاد مرد موت کے انتظار کی خاطر نہیں بلکہ اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہتے اور مرتے ہیں۔ اگر اصول یا نصیب العین کی خاطر زندہ

ایران سے واپسی پر لاہور ائر پورٹ پر جاوید اقبال فردوسی بیگم اور گلوکارہ روبینہ قریشی کے ہمراہ

دہلی میں اندرا گاندھی کے ساتھ یوم اقبال کی تقریب میں

رہنے اور مرنے کی توفیق نہیں تو زندگی محض نباتاتی یا حیواناتی زندگی ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی انسانی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈُوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈُوبے ادھر نکلے

یہ جواب تو اس سوال کا تھا کہ علامہ کی سیرت و شخصیت کا مجھ پر ذاتی طور پر کیا اثر ہوا۔ اب اسی سوال کے دوسرے حصے، یعنی علامہ کی سیرت اور تعلیمات سے میں نے فکری طور پر کیا اثر قبول کیا، کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے گھر کا ماحول دینی بھی تھا اور علمی بھی، میں نے اس ماحول سے غیر شعوری طور پر یہ اثر قبول کیا کہ اسلام میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے ذریعہ وقت کے ہر نئے تقاضے کی تعبیر ممکن ہے۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو بیک وقت قدامت پسند بھی ہے اور جدید بھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس نے مجھ میں دنیائے جدید کو سمجھنے کے لیے تجسس پیدا کیا۔

مجھ میں لکھنے کے شوق کی بنیاد تیرہ چودہ سال کی عمر سے پڑ چکی تھی گو میری تحریریں قابل توجہ نہ تھیں۔ علامہ کی زندگی میں ہی پہلی بار 1938ء میں میں نے یوم اقبال کے جلسہ میں جناب خواجہ غلام اسیدین کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ جلسہ مینار ڈہال میں منعقد ہوا تھا۔ علامہ کی وفات کے بعد لکھنے کا شوق جاری رہا۔ لیکن اس شوق کا دائرہ محض ادبی تحریروں تک محدود تھا۔ ان دنوں میں ترقی پسندی کی تحریک سے خاصا متاثر ہوا۔ میری تحریریں ترقی پسند رسالوں میں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں اسی دور میں یعنی 1940ء سے لے کر 1947ء تک پاکستان کے حصول کے لیے سیاسی کشمکش شروع ہوئی۔ اس کشمکش نے اکثر مسلم طلباء کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کشمکش کے آخری ایام میں جب خضر وزارت نے، "ڈان" اخبار کے پنجاب میں داخلہ پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں تو چند طلباء نے ایک زمین دوز اخبار نکالا جس کا نام "نوائے اسلام" رکھا گیا۔ اس اخبار کے ادارہ سے میں بھی منسلک تھا۔ دراصل یہ اخبار کچھ عرصہ تک میرے گھر میں ہی ترتیب دیا جاتا رہا۔

علامہ کی شخصیت سے متعلق پہلا مضمون بعنوان " اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" میں نے 1946ء میں تحریر کیا۔ یہ مضمون اس سال یوم اقبال کے موقعہ پر

ریڈیو اسٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا تھا۔ 1948ء میں یوم اقبال کے موقعہ پر اسلامیہ کالج ہال میں پہلی مرتبہ میں نے ایک مقالہ بعنوان "اقبال کا تصور اجتہاد" پڑھا۔ اس سے اگلے سال "اقبال کے مابعد الطبیعاتی تصور میں اخلاقیات کا مقام" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جو اردو اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ اسی دور میں کچھ مضمون قائداعظم ، تحریک پاکستان اور علمی، ادبی یا فلسفیانہ موضوعات پر تحریر کیے جو شائع ہوئے۔ مگر یہ تمام کوششیں طالب علمی کے زمانہ کی تھیں۔

انگلستان جانے سے پیشتر میں ایم۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے انگریزی ادب سے متعارف ہو چکا تھا۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے مجھ میں یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور المانوی ادب کے شہ کاروں کو پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ میں نے یورپی کلاسیکی اور ماڈرن لٹریچر کا انگریزی تراجم کے ذریعہ مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو فارسی اور عربی ادب سے شناسائی پیدا کی۔ بعد میں ایم۔ اے فلسفہ کے طالب علم کی حیثیت سے میں اسلامی اور مغربی فلسفہ سے متعارف ہوا۔ فلسفہ کے مطالعہ نے میرے انداز فکر میں ایک نیا تجسس پیدا کر دیا۔ انہی ایام میں چودھری محمد حسین کے زیر اثر کلام اقبال کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ دینیات فلسفہ، منطق، تصوف، اخلاقیات اور ادب پر چودھری صاحب کے ساتھ مناظرے میرے ذہنی ساخت کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئے۔

تاریخ اسلام کے پس منظر میں میں نے "اسلامی تصور ریاست" کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں میں نے قرآن و حدیث کے علاوہ الماوردی کی "احکام السلطانیہ" اور دوسری کتب کا مطالعہ کیا۔ مسلم سیاسی مفکر جو یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے، ان کی تحریروں کو دیکھا۔ "مقالات افلاطون" دوبارہ پڑھے۔ نیز فارابی کا سیاسی فلسفہ، غزالی کا تصور امامت نصیر الدین طوسی، ابن خلدون وغیرہم کی سیاسی فلسفہ سے متعلق تحریریں نگاہوں سے گزریں۔ یہ مطالعہ میرے تحقیقی مقالہ کے تعارفی باب کے سلسلہ میں تھا جسے تحریر کرنے میں مجھے دو سال کا عرصہ لگا۔ میں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلام کی حقیقی روح صرف جمہوریت کے نفاذ سے ہی مادی دنیا میں منکشف ہو سکتی ہے۔ اگر امویوں نے خلافت کو موروثی شکل نہ دی ہوتی تو رفتہ رفتہ اصحابہ کا اجتماع ایک مجلس آئین ساز کے قیام پر منتج ہوتا۔ براہ راست انتخاب کے ذریعہ خلیفہ کا تقرر کیا جاتا اور

اسی طریقہ انتخاب سے مجلس آئین ساز کے ارباب بست و کشاد بھی چنے جاتے یوں خلفاء و سلاطین کے فرمان عوام کی نگاہ میں قطعی بے وقعت ہوتے اور آئین اسلام کا نفاذ اجماع امت کے ذریعہ ہوتا۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ بلکہ جابر اور ظالم حاکموں نے اجماع امت کے ذریعہ وضع کیے ہوئے آئین کی بجائے فرمان کے ذریعہ حکومت کی۔ اس اعتبار سے 661ء سے روح اسلام محبوس ہے۔

میرے سفر کی دوسری منزل برصغیر ہند میں اسلامی حکومت کے عروج و زوال کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ جن شخصیتوں سے میں متاثر ہوا وہ البیرونی اور شیخ احمد سر ہندی تھے۔ البیرونی سلطان محمود کی معیت میں دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہندوستان آئے۔ اپنی تصنیف "کتاب الہند" میں انہوں نے ہندوؤں کی عادات و رواجات کا مسلمانوں کی عادات اور رواجات سے مقابلہ کرتے ہوئے تحریر کیا۔

"یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوؤں نے اپنے رواجات کو دیدہ دانستہ طور پر مسلمانوں کے رواجات کے برعکس شکل دے رکھی ہے۔ ہمارے رواجات ہندوؤں کے رواجات سے مشابہت نہیں رکھتے بلکہ قطعی الٹ ہیں۔ اور اگر اتفاق سے ان کا کوئی رواج ہمارے کسی رواج سے مشابہت رکھتا بھی ہے تو اس کے معنی قطعی الٹ ہوتے ہیں۔"

پھر البیرونی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے تعلقی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے تحریر کیا۔

"ہندوؤں کے تمام تر تعصب کا نشانہ وہ لوگ بنتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہیں یعنی جو نووارد (مسلمان) ہیں۔ وہ انہیں "ملچھ" کہتے ہیں جس کے معنی ہیں غلیظ یا ناپاک وہ ان سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ نہ ان سے ازدواجی تعلق قائم رکھتے ہیں اور نہ کسی اور قسم کا تعلق۔ نہ انکے ساتھ مل بیٹھنے پر رضا مند ہوتے ہیں، نہ کھانے اور نہ پینے پر کیونکہ یوں، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پلید ہو جائیں گے۔ ان کے نزدیک ہر وہ شے پلید ہے جسے مسلمانوں کی آگ یا پانی نے چھوا ہو۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی گھر ان دو فطری عناصر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ انہیں کسی غیر ہندو کو اپنے ہاں بلانے کی اجازت نہیں اگرچہ غیر ہندو اس دعوت کا کتنا ہی خواہش مند کیوں نہ ہو یا ان کے مذہب کی طرف مائل ہی کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں ان سے مسلمانوں کا کسی قسم کا

تعلق قائم ہوسکنا قطعی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جو عبور نہیں کی جاسکتی"

ان خیالات کا اظہار آج سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود البیرونی کی یہ تحریریں قائداعظم کی تقریروں کے اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال ایک حقیقت واضح ہوگئی کہ برصغیر ہند میں اسلام کے ورود کے ساتھ ہی (اسلام ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی میں وارد ہوا) ہندو مسلم کے امتیاز کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام سے پیشتر جو تمدن بھی ہندوستان میں وارد ہوئے وہ اس کے اندر جذب ہوگئے لیکن اسلام جذب نہ ہوسکا۔ بالفاظ دیگر کسی غیر مسلم تمدن میں جذب ہونا اسلام کی فطرت کے خلاف ہے گو اسلام اپنے اندر کسی غیر مسلم تمدن کی مثبت قدریں جذب کرسکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کے ورود کے آٹھ سو سال بعد یعنی سولھویں صدی عیسوی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں مدغم کرنے کی پہلی شعوری کوشش شہنشاہ اکبر نے "دین الٰہی" کے ذریعہ کی۔ اس زمانے میں ایسا سیاسی مقصد مذہب کے ذریعہ سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ تب ہندوستان میں بہت سے صوفیاء کے طریقے رائج تھے۔ اس لیے اکبر نے "دین الٰہی" کو بطور ایک صوفی طریقہ پیش کیا۔ لیکن اس کی کوشش ناکامیاب رہی کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں اس ادغام کے خلاف تھے۔ "منتخب التواریخ" کے مصنف ملا بدایونی تحریر کرتے ہیں کہ جب اکبر نے مان سنگھ کو "دین الٰہی" قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے کہا "میں حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں اور مجھے آپ کی ذات سے عقیدت ہے۔ آپ میرے بادشاہ ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو بندہ اپنی جان حضور پر سے قربان کرسکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ "دین الٰہی" قبول کرلو تو اس میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس ملک میں درحقیقت دو مذہب ہیں ایک ہندومت اور دوسرا اسلام میں یہ تو کرسکتا ہوں کہ آپ کے کہنے پر اسلام پر ایمان لے آؤں۔ مگر مجھے یہ نہ کہیے کہ "دین الٰہی" قبول کرلوں"۔

اکبر کی کوشش کو ناکامیاب بنانے کے سلسلہ میں جو خدمات شیخ احمد سرہندی نے انجام دیں وہ نہایت اہم ہیں۔ بقول علامہ اقبال شیخ احمد سرہندی ہندوستان میں مسلم قومیت کے بانی تھے۔ مجھے کیمبرج میں "مکتوبات شیخ احمد" پڑھتے وقت اس سوال

کا جواب ملا کہ علامہ نے میرے پیدائش کے لیے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی بارگاہ میں دعا کیوں کی تھی اور بعد میں مجھے اپنے ہمراہ لے کر بارگاہ مجدد میں دوبارہ کیوں حاضر ہوئے۔

شیخ احمد نے سلسلہ نقشبندیہ کو اسلام کے حقیقی مقصد سے مزین کیا۔ انہیں ہماری ملی تاریخ میں جو عظیم سیاسی مرتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا گیا۔ دراصل ہماری ملی تاریخ اور پاکستان کے قیام کے پس پشت جو خدمات سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ نے انجام دیں ہم ان کا اندازہ لگانے سے بھی محروم رہے ہیں۔

شیخ احمد نے کشف کے ذریعہ اس حقیقت کو عیاں کردیا کہ ابن عربی سے متاثر صوفیاء کا تصور "وحدت وجود" دراصل "وحدت شہود" ہے۔ یعنی خدا کی ذات اور صفات یا خالق و مخلوق مجموعی طور پر وحدت نہیں بلکہ بظاہر وحدت ہے۔ درحقیقت خدا کی ذات بحیثیت خالق اپنی صفات و مخلوقات سے ماورا ہے۔

"وحدت وجود" کے حامی صوفیاء کا ایمان تھا کہ ہر شے میں خدا ہے بلکہ ہر شے خدا ہے۔ اسی تصور سے متاثر ہوکر اکبر نے "دین الٰہی" ترتیب دیا اور اس صوفی نظریہ کی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ادغام کی کوشش کی۔ شیخ احمد نے یہ واضح کردی کہ خالق کی ذات اپنی مخلوقات سے علیحدہ ہے اور مخلوقات اس کی ذات تک کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ انسان کے لیے خداوند تعالیٰ کا قرب صرف ایک ہی ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ غیب پر ایمان لائے، کتاب اللہ میں اللہ نے جو احکامات دے رکھے ہیں ان کی تعمیل بطور فرض کرے اور جب کبھی وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ بالفاظ دیگر اسلام دراصل شریعت کی پابندی ہے۔ یہی نظریہ ابن تیمیہ کا تھا لیکن ابن تیمیہ عالم تھے، عارف نہ تھے۔ شیخ احمد تصوف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کرکے واپس کتاب اللہ کی طرف لے آئے۔ تصوف کی اس تطہیر نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی ملی وحدت کو استحکام بخشا۔

کچھ عرصہ بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے ادغام کی دوسری شعوری کوشش داراشکوہ نے کی لیکن اسے اورنگ زیب عالمگیر نے ناکامیاب بنا دیا۔ علامہ کی نگاہ میں اورنگ زیب عالمگیر بھی مسلم قومیت کے بانیوں میں سے تھے۔ بعض ہندو اور انگریز مورخ یہ تحریر کرتے ہیں کہ اورنگ زیب ایک متعصب حاکم تھا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں

کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل ڈھونڈھنے کے لیے ہندوؤں کو زبردستی اسلام قبول کروایا۔ نتیجتہً برصغیر ہند کی مسلم آبادی زیادہ تر ان ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ جنہیں زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا۔ لیکن غور طلب بات تو یہ ہے کہ اگر یہ تبدیلئ مذہب زبردستی ہوتی تو اورنگ زیب کے دستہ میں کیا چیز حائل تھی کہ اس مسئلہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی خاطر سب کے سب ہندوؤں کو بزور شمشیر مسلمان نہ بنالیا۔

جنوبی امریکہ کے ممالک میں ہسپانیہ نے کیتھولک مذہب کا نفاذ، زبردستی کیا تھا لیکن اس کا ردعمل یہ ہے کہ جوں جوں قوم پرستی کی تحریک وہاں زور پکڑ رہی ہے، کیتھولک مذہب کو مغربی شہنشاہیت کا ایک نشان تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس برصغیر ہند کے مسلمان اپنے مذہب پر کس قدر نازاں ہیں۔اگر اسلام ان پر زبردستی ٹھونسا گیا ہوتا تو وہ پاکستان کے حصول کے لیے تگ ودو نہ کرتے بلکہ اسلام کو عربوں، ترکوں، افغانوں ایرانیوں، تاتاریوں یا مغلوں کے دور شہنشاہیت کا نشان سمجھ کر ٹھکرا دیتے۔

میرے سفر کی تیسری منزل برصغیر ہند میں اسلام کے احیاء کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا وہ شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسمعیل شہید تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریروں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ فقہ اسلامی اجتہاد کے دروازے کھولنے سے ہی متحرک ہو سکتی ہے۔ نیز شاہ اسمعیل شہید کے غیر مقلد ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تنزل شدہ اسلامی معاشرہ کا فقیہی جمود توڑنا چاہتے تھے۔ یہ تاثر ان کی تصانیف "صراط مستقیم" اور "تقویت الایمان" کے مطالعہ سے قائم ہوتا ہے۔ علامہ کے نزدیک یہ دو ہستیاں ان بلند پایہ علماء میں سے تھیں جنہیں ہندی اسلام نے پیدا کیا۔

سید احمد بریلوی کی تحریک (جسے، وہابی، تحریک بھی کہا جاتا ہے) اصلاحی بھی تھی، سیاسی بھی اور معاشرتی بھی۔ اصلاحی طور پر اس تحریک نے اسلام کو غیر شرعی بدعتوں سے پاک کیا۔ سیاسی اعتبار سے چونکہ غیر مسلم ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور ہندوستان دارالحرب، قرار دیا جا چکا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے سامنے صرف دو ہی رستے تھے۔ یا تو اپنا کھویا ہوا سیاسی مقام حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا ہندوستان چھوڑ کر کسی مسلم یعنی "دارالاسلام" میں ہجرت کر جائیں۔ اصولی

طور پر مسلمان ہندوستان میں محکوموں کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے تھے۔ معاشری اعتبار سے اس تحریک نے مسلمانوں کو ایک نیا احساس وقار بخشا۔ جہاد کی دعوت دے کر اس نے "کمین ذات" مسلمانوں کے دلوں میں مل جل کر اسلام کی سر بلندی کی خاطر بر سر عمل رہنے کا جذبہ پیدا کیا اور یوں ان عامی مسلمانوں کو اپنی گری ہوئی معاشری سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لاکھڑا کیا۔

سید احمد بریلوی کی تحریک کے مطالعہ نے مجھے زندگی میں پہلی بار یہ احساس دلایا کہ اسلام دراصل دین انقلاب ہے اور اگر رسول اکرمؐ کی سیرت کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو حضورؐ بھی ایک انقلابی کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پس مسلمان سوائے انقلابی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا یہ اسکی فطرت میں ہے کہ ہر وقت انقلاب کے لیے کوشاں ہو اور ہر فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کرتا رہے۔ ورنہ وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ سید احمد بریلوی کا جہاد صرف انگریزوں کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ خود اپنے خلاف بھی، یعنی مسلمانوں کی ناگفتہ بہ سیاسی، معاشری اور اقتصادی حالت کے خلاف بھی تھا۔

میرے سفر کی چوتھی منزل برصغیر ہند کے مسلمانوں پر مغربی نظریات کے اثر کا جائزہ لینے سے شروع ہوئی۔ میں جس شخصیت سے متاثر ہوا وہ سرسید احمد خاں تھے۔ علامہ کی علی گڑھ سے وابستگی اور سید راس مسعود سے والہانہ محبت کا باعث یہی تھا کہ دونوں سرسید کی یادگاریں تھیں۔

سرسید نے مسلمانوں کو اس حقیقت کا احساس دلایا کہ قرون وسطیٰ کا دور ختم ہو چکا۔ اب دور جدید کی ابتدا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ اس لیے مغرب کے قائم کردہ نئے تمدن سے شتر مرغ کی طرح منہ چھپانے کی بجائے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سرسید نے مسلمانوں کی توجہ نئی تعلیم کی طرف مبذول کی۔ ان کے دلوں میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرنے کی خواہش پیدا کی۔ انہوں نے قرون وسطیٰ کی ذہنیت رکھنے والے علماء کو بھی یہ احساس دلایا کہ ماضی کی طرف منہ اور مستقبل کی طرف بیٹھ کر کے مت کھڑے رہیں بلکہ وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھیں اور اپنا زاویہ نگاہ بدلیں تاکہ ہم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھ سکیں۔

سرسید کی مثبت تعلیمات کے زیر اثر مسلمانوں نے اپنی تعلیمی تمدنی، معاشری

اور اقتصادی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ سیاسی اعتبار سے سرسید نے اس نظریہ کا برملا اظہار کیا کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ اور مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ فی الحال اپنی تمام تر توجہ ملی حالت کو بہتر بنانے پر صرف کریں۔

میں اپنے سفر کی پانچویں منزل میں، اتحاد اسلام (پین اسلام ازم) خلافت اور مسلم قوم پرستی، کی تحریکوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا وہ جمال الدین افغانی اور مولانا شبلی نعمانی تھے۔ علامہ اقبال جمال الدین افغانی کو اسلام کے دور جدید کا مجدد سمجھتے تھے۔ جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ دنیائے اسلام کی آزادی اور سربلندی اسی صورت ممکن ہے کہ مسلم ممالک کا دفاق عمل میں لایا جائے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ جب تک مسلمان مغرب کے وسائل قوت واقتدار کو نہ اپنالیں ان کے لیے مغربی شہنشاہیت اور سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دینا محال ہے۔

مجھے مولانا شبلی کے "ریڈیکل ازم" نے بے حد متاثر کیا۔ ان کی توجہ کا مرکز دراصل مسلم کاشتکار تھے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ان کے ذہن میں اسلام کا تصور بحیثیت ایک فلاحی ریاست موجود تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے 1912ء میں "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے زیر عنوان سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس زمانے میں مسلم لیگ عوامی جماعت نہیں تھی بلکہ مفاد پرستوں کا ایک گروہ اس پر قابض تھا۔ جس نے اسے حکومت سے مراعات حاصل کرنے کا، ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ مولانا شبلی نے تحریر کیا۔

"اس موقعہ پر پہنچ کر دفعتہً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے، مسلم لیگ۔ یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالٹیکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ انٹی کانگرس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاوس آف لارڈز ہے؟ ہاں، سوانگ تو اسی قسم کا ہے------ پالیٹکس کی بحث میں ہمارا سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالٹیکس نہیں بن سکتی------ جس گروہ کے نزدیک صرف زبان سے کوئی لفظ بول دینا پالٹیکس ہے وہ کیونکر پالٹیکس کی حقیقت سمجھ سکتا ہے پالٹیکس ایک سخت قومی احساس ہے۔ اس کا ظہور بیگار کے طریقہ پر نہیں ہوتا۔

یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو دل و دماغ اور اعضا سب مصروف کار ہو جاتے ہیں۔ لیگ کا طرز عمل بتاتا ہے کہ اس کی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے۔"

آپ نے مسلم لیگ کے نظام ترکیبی پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے۔ اس کو ------ وہ مہرے مطلوب ہیں جن پر طلائی رنگ ہو، لیکن پالٹیکس کی بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے؟ کیا ایک معزز رئیس ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولت مند کسی تحریک کے لئے اپنی جائیداد، اپنی حکام رسی، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے؟ ------- آج کل کسی شخص کی پرائیویٹ حالت پوچھنا خلاف تہذیب ہے لیکن بہ ضرورت مسلم الیگ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ مالی حالت کے لحاظ سے آپ کی ہستی کیا ہے؟ تو جواب ملے گا۔ ایک خاص "دست کرم" اس بنا پر مسلم لیگ کے تمام منصوبے، تمام تجویزات، تمام ارادے اسی دست کرم کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔"

میرے سفر کی چھٹی منزل برصغیر ہند میں "مسلم قوم پرستی" کے فروغ کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ ساتویں منزل آخری تھی۔ اس میں قائداعظم کی شخصیت اور پاکستان کو معرض وجود میں لائے جانے کی تفصیل دی گئی۔

اس طویل سفر کے دوران میں مجھ پر دو مزید راز کھلے۔ ایک تو یہ کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو متضاد روئیں ایک دوسری سے متصادم ہوتی رہیں۔ پہلی رو تو اس مکتبۂ فکر کی تھی جو مسلمانوں کا ہندوؤں میں ادغام عمل میں لانا چاہتا تھا۔ اس مکتبۂ فکر کے حامی شہنشاہ اکبر، داراشکوہ اور ہماری جدید سیاسی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ دوسری رو اس مکتبۂ فکر سے ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کی ملی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر اسلام کی بنیادوں پر عمل میں لانے کا خواہش مند تھا۔ اس مکتبۂ فکر کے حامی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، سرسید احمد خان، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال اور قائداعظم تھے۔ قیام پاکستان سے ثابت ہے کہ اس تاریخی تصادم میں آخرکار کونسی رو غالب آئی۔

اس مطالعہ سے دوسرا راز جو مجھ پر افشا ہوا وہ یہ تھا کہ جب سے اسلام برصغیر ہند میں وارد ہوا روح اسلام اپنی نمو کی خاطر راہ ڈھونڈنے کی سعیٔ پیہم کرتی رہی۔ گذشتہ بارہ سو برسوں میں کبھی تو اس نے مشاہدہ کے ذریعہ اور کبھی کشف کے ذریعہ اسی کوشش کا اظہار کرنا چاہا۔ کبھی شہنشاہوں کے فرمان کی صورت اختیار کی، کبھی علماء کی وساطت سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی، کبھی مجاہدین کی تلواروں کی راہ سے، کبھی جدید سیاسیات کے بھیس میں، کبھی دنیائے اسلام کے اتحاد کی داعی کی ہیئت میں، کبھی ادب اور کبھی فلسفہ کی شکل میں۔ غرضیکہ اس نے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ حتیٰ کہ 1930ء میں جا کر اسے واضح زبان نصیب ہوئی جب وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ڈھل گئی آخرکار قائداعظم کے ہاتھوں پاکستان کے قیام کے ذریعہ اس نے بارہ سو سال کی جدوجہد کے بعد اس مقصد کو پا لیا۔

ارتقائے انسانی کے بارے میں مشرق و مغرب کے مفکروں نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں۔ جلال الدین رومی کے نزدیک انسان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا فرشتوں کے مقام تک جا پہنچے گا۔ ابن مسکویہ کی نگاہ میں حیات معدنی، نباتاتی اور حیواناتی منازل سے گزرتی ہوئی، انسانی منزل تک پہنچی اور اس منزل سے اس کی ارتقاء نے اسے نبوت کی منزل تک پہنچا دیا۔ ڈارون نے یہ مشاہدہ کیا کہ حیات کی ابتداء دراصل پانی میں ہوئی اور رفتہ رفتہ خشکی پر مختلف حیواناتی منازل طے کرتی ہوئی انسان تک پہنچی۔ اس سائنس دان کی رائے میں تحریک حیات دراصل ایک اندھی میکانکی قوت ہے جو اپنے آپ کو اپنے ہی وزن کے زور سے آگے دھکیلتی چلی آئی ہے۔ برگساں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تحریک حیات درحقیقت تخلیقی ہے اور حیات کی جس شاخ میں قوت تخلیق نہیں رہتی وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ دریائے حیات اپنی باطنی تخلیقی قوت کے زور سے بل کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اُس کی جس شاخ میں قوت تخلیق ناپید ہوئی وہ پس آب کی صورت میں پیچھے رہ گئی۔ حیات کی یہ پس آب کی صورت میں پیچھے رہی ہوئی جامد جھیل دلدل میں منتقل ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ نطشہ نے یہ تصور پیش کیا کہ تحریک حیات جاری و ساری ہے۔ لہٰذا انسان کی اگلی ارتقائی منزل، مافوق البشر ہے۔ اس کے نزدیک مافوق البشر صاحب امر یعنی حاکم ہوگا اور عامی انسان

اس کے تابع اور محکوم ہوں گے۔

ان نظریات اور تاریخ انسانی کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تغیر حیات کا اصل راز ہے۔ اگر ہم دنیائے جدید پر نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اب یہ تغیر انسان کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ارتقاء کی صورت میں منکشف ہو رہا ہے۔

جاوید اقبال سابق امریکی صدر نکسن کے ساتھ (۱۹۸۴ء)

1959ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ ڈھاکہ کے اجلاس سے جاوید اقبال خطاب کر رہے ہیں

1979ء میں اسلامک سنٹر لندن میں جاوید اقبال فکر اقبال کے موضوع پر تقریر کر رہے ہیں ان کے ساتھ مجلس اقبال لندن کے صدر پروفیسر شریف بقا کھڑے ہیں۔

چودھری رحمت علی، علامہ اقبال اور تصور پاکستان

یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ 1940ء میں قرارداد لاہور پاس کی گئی۔ قرارداد لاہور کی دو تین باتیں جس پر غور کرنا چاہیئے۔ اس میں پہلے تو لفظ پاکستان کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں مرکز کا مسئلہ بھی واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں یہی تھا کہ برصغیر کے جن خطوں میں مسلمانوں کی آبادی ہے اس میں علیحدہ ریاستیں قائم کی جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا موقف چودہ نکات ہی تھے۔ وہ مرکز کے مسئلے کو اوپن رکھنا چاہتے تھے تاکہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے تو اس کے لیے صورت کھلی رکھی جائے۔ حضرت علامہ نے بھی جب 1930ء میں الہ آباد کا خطبہ دیا تو اس میں انہوں نے جو تصور مسلم ریاست کا دیا کہ شمال مغرب میں سارے صوبوں کو اکٹھا کر کے ایک مسلم سٹیٹ بنا دی جائے۔ اس میں بھی انہوں نے اصطلاح دی کہ برٹش امپائر کے اندر یا اس کے باہر۔۔۔۔۔۔۔ تاکہ گفت و شنید کا دروازہ کھلا رہے اور ایسی صورت نہ ہو جو انگریز اور ہندو کو قابل قبول نہ ہو۔

علامہ کے ابتدائی تصور میں تو بنگال کا ذکر نہیں تھا۔ البتہ پنجاب کے وہ خطے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ اس میں سے نکالنے کو تیار تھے تاکہ مغربی پنجاب مسلم اکثریت ہو جائے۔ وہ اس ضمن میں ایک عملی تجویز دے رہے تھے لیکن مرکز کے مسئلے میں وہ بھی خاموش تھے۔

اس وقت مسلم زعماء کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایسی پوزیشن اختیار نہ کریں جو کہ نہ ہندوؤں کو قبول ہو نہ انگریزوں کو۔ اور ہمیں۔ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن اسی دوران چودھری رحمت علی اور دیگر اصحاب جو کیمبرج میں تھے انہوں نے اسی تصور سے آئیڈیا لے کر لفظ پاکستان کو قائم کیا اور چودھری رحمت علی نے مسلم لیڈر شپ سے

چار قدم آگے جا کر یہ کہا کہ نہیں جی ان کی فیڈریشن ہی الگ بنائی جائے۔ یعنی پاکستان ایک ملک ہی علیحدہ ہو۔

رحمت علی کی پاکستان سکیم کو چرچل کی حمایت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے ہندوؤں نے مسلم لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ یہ تو انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان کے ٹکڑے کروا رہے ہیں۔ علامہ پر بھی یہ الزام لگایا گیا اور آج بھی ہماری سیاست میں جو ہندوستان کی حمایت میں حلقے ہیں وہ اسی بات کو بار بار دہراتے ہیں۔ بعض اوقات یہ غلط فہمی اس لیے بھی پھیلائی جاتی ہے کہ علامہ کے خطوط مولانا راغب احسن کے نام یا علامہ کے خطوط ایڈورڈ ٹامسن کے نام جن میں انہوں نے کہا ہوا ہے کہ میرا کوئی تعلق پاکستان کی سکیم کے ساتھ نہیں تو اس سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کا تعلق مسلم ریاست سے تھا۔ اس وقت کے مطابق علامہ نے درست کہا تھا کہ ہمارا تعلق پاکستان کی تحریک کے ساتھ نہیں سے یہ مراد ہے کہ ہمارا جو مطالبہ ہے اس کا تعلق چودھری رحمت علی کے پاکستان کی اسکیم کے ساتھ نہیں۔۔۔۔۔ یہی الفاظ خلیفہ شجاع الدین کے بھی ہیں کہ یہ سکیم تو ایک طالب علم کی ہے اس کا تعلق مسلم لیڈرشپ کے ساتھ نہیں۔۔۔ اس طرح ظفر اللہ خان سے بھی یہی الفاظ منسوب کئے جاتے ہیں۔ قائداعظم سے جب پوچھا گیا کہ آپ کا چودھری رحمت علی کی پاکستان سکیم کے بارے میں کیا خیال ہے تو انہوں نے یہ جواب دیا میں سمجھتا ہوں یہ ایک ایسے اناڑی کی سکیم ہے جو کہ تاش کے پتے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے میز پر رکھ کر سب کو دکھا دے۔

قرارداد لاہور کے بعد جب قائداعظم نے علی گڑھ میں تقریر کی تو تب بھی انہوں نے واضح کیا کہ ہم نے پاکستان کا لفظ اس میں استعمال نہیں کیا تھا۔ قائداعظم نے کہا کہ پاکستان کا نام ہندوؤں نے دیا۔ اس تقریر کو سامنے لائیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قائداعظم نے یہ کوشش آخری دم تک کی کہ اگر ہندوؤں سے کوئی تصفیہ ہو سکتا ہے تو ہم تصفیہ کرنے کو تیار رہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہندوستان دولخت ہوا تو وہ ہندو کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوا جیسے آج بھی کشمیر کے مسئلے پر ہندو کا جو موقف ہے اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی جو علیحدگی کا رستہ اختیار کرنا پڑا تو اس کی وجہ بھی ہندوؤں کی ہٹ دھرمی تھی۔۔۔۔ یہ وہ دور تھا جس میں پاکستان کی تحریک جاری ہوئی۔ ایک طرف عالمی جنگ شروع ہو

گئی اور دوسری طرف یہ تحریک جاری تھی۔

ایک ایسی سٹیج بھی خضر حیات کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں آئی۔ جوں جوں ہم تقسیم کے قریب پہنچ گئے جس وقت ڈان کا داخلہ پنجاب میں ممنوع ہو گیا۔ اس زمانے میں ہم چند لوگ مثلاً شیخ خورشید احمد، ایم بی زمان (سابق ایڈووکیٹ جنرل پنجاب) ڈاکٹر مسعود کے بیٹے الیاس مسعود وغیرہ نے مل کر ایک اخبار جاری کیا جو میرے گھر سے نکلتا تھا۔ ہم اس کو سائیکلوسٹائل کرتے تھے۔ اس کا نام "نوائے اسلام" تھا۔۔۔۔۔۔ یہ انگریزی اور اردو میں نکلتا تھا۔ یونینسٹ حکومت جو مظالم مسلم لیگیوں پر کرتی تھی اس کی خبریں ہم شائع کرتے تھے۔ یہ سب کچھ جاوید منزل ہی میں ہوتا تھا وہیں سائیکلوسٹائل مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے گھر کے بالکل سامنے ملک بلڈنگ تھی جس میں سی آئی ڈی کا آفیسر رہتا تھا۔ اسے سب پتہ تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں کہ وہ خود ہمیں کہتا تھا کہ اس طرح کرو اور اس طرح نہ کرو۔ تاکہ اس کی خبر باہر نہ ہونے پائے پھر ہم میں بعض لوگ دلی جاتے تھے اور وہاں سے ڈان اخبار کی ہزاروں کاپیاں سوٹ کیسوں میں بھر کر لاتے تھے۔۔۔۔ اسی طرح ہم نے ڈان کی ترسیل کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض ہم میں سے نوجوان گرفتار بھی ہوئے۔ اخبار ہم مفت تقسیم کرتے تھے۔

اقبال شناسوں کے متعلق رائے

س:۔ علامہ اقبال جیسی شخصیت کا فرزند ہونے کی بنا پر آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔
جاوید اقبال:۔ اس بارے میں زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ علامہ جیسی شخصیت کے ساتھ نسبت کا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ آپ کے والد کیا کرتے ہیں تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب سکول اور کالج کی تعلیم حاصل کی تو ان کی ذات کے ساتھ نسبت نے مجھے ایک قسم کے تفاخر کا احساس دیا جس کے بعض پہلو جائز بھی ہو سکتے ہیں اور بعض غلط۔ اس سے اگلی منزل پر جب میں نے بذات خود تحقیق کا کام کیمبرج جیسے ادارے میں کیا جہاں نہ تو زیادہ تعداد میں علامہ اقبال کو جاننے والے تھے اور نہ مجھے اور اس کے ساتھ ساتھ جب میری خود اعتمادی بڑھی ان کے ساتھ نسبت کی اہمیت میرے لئے ایک طرح سے الجھن (المبیر لیسمنٹ) بننے لگی۔ اس حساب سے کہ میری اپنی شخصیت ان کی شخصیت سے دب گئی جس کی وجہ سے المبیر لیسمنٹ کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے بہت بڑے سایہ دار درخت کے نیچے چھوٹا سا پودا ہو۔ کیونکہ اس دور میں جب بھی مجھے متعارف کرایا جاتا تو یہی کہا جاتا کہ یہ علامہ اقبال کا بیٹا ہے بجائے اس کے کہ میں خود کون ہوں اور اب جب کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنا علیحدہ مقام بنا لیا تو مجھے ان کی ذات سے کوئی الجھن نہیں ہوتی بلکہ اس سے تفاخر کا احساس مثبت طور پر ہوتا ہے۔
س:۔ علامہ اقبال نے آپ کے نام پر جاوید نامہ لکھی اور اس کے علاوہ اردو فارسی کی کئی نظموں میں بھی انہوں نے آپ کو مخاطب کر کے نوجوانوں کو کچھ نصیحتیں کی ہیں آپ کا ان نظموں کے بارے میں کیا خیال ہے؟
جاوید اقبال:۔ مجھے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں ایک سمبل کے طور پر پیش کیا ہے یہ مشرقی ادب کی ایک روایت ہے کہ جب بھی کوئی عظیم فلسفی، شاعر یا عالم نوجوان نسل سے

مخاطب ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتا ہے۔ یعنی مراد اس سے یہ ہے کہ جس طرح بیٹا عزیز ہے اسی طرح قوم کے دوسرے نوجوان عزیز ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت علامہ نے اسی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں کہیں مجھ سے خطاب کیا ہے یہ شباب ملت سے خطاب ہے۔ جاوید نامہ میں جو نظم مجھ سے منسوب کی گئی ہے اس میں یہ بھی تحریر ہے۔ خطاب بہ نژاد نو۔۔۔۔۔
س:۔ علامہ اقبال نے اس طرح کے جو اشعار کہے ہیں۔
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اس آئیڈیل کے مطابق زندگی بسر کی۔
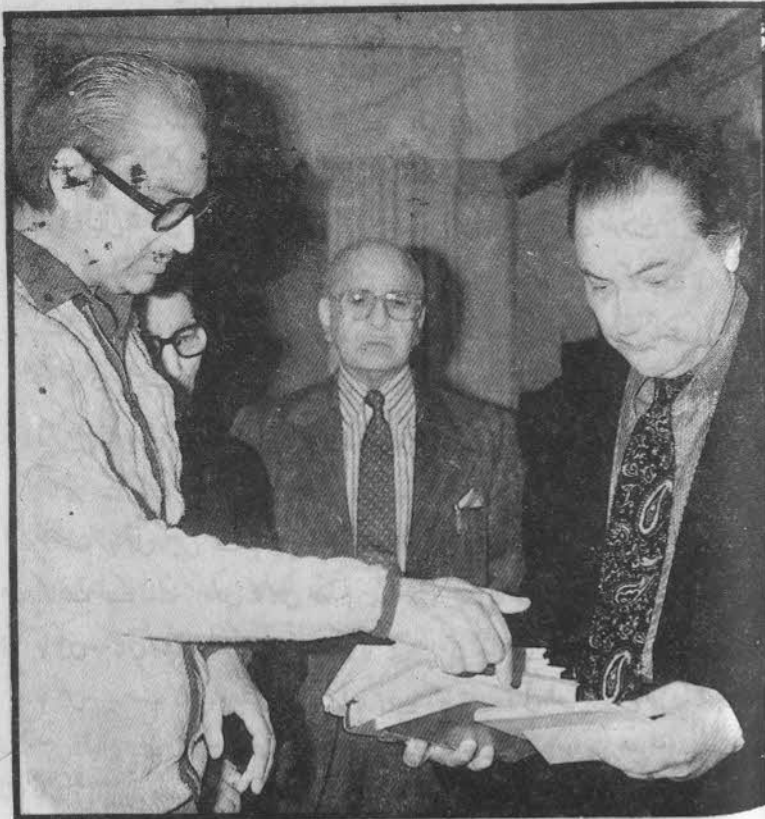
ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتابوں کا سیٹ جاوید اقبال کو پیش کر رہے ہیں۔

جاوید اقبال:- علامہ کے اس شعر کے معنی میری نگاہ میں یہی ہیں کہ ان کے نزدیک امیری سے مراد سرمایہ داری ہے اور غریبی سے مراد غربت یا افلاس نہیں بلکہ فقر، استغناء اور درویشی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس شعر میں وہ نوجوانان ملت کو کسی قسم کے سوشلزم کا سبق نہیں دے رہے بلکہ اسلامی اخلاق کا سبق دے رہے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ سرمایہ داری اور دوسروں کے استحصال کو نصب العین نہ بنایا جائے یا زندگی کی مادی آسائشوں کے پیچھے ہی کتوں کی طرح اندھی دوڑ میں شریک نہ ہوا جائے بلکہ ایسی زندگی کو اپنا شعار بنایا جائے جس کی بنیاد فقر، استغناء اور درویشی ہو۔ اقبال کے ہاں فقر کی بڑی وقعت ہے۔ ان کے نزدیک غربت و افلاس ایک طرح کا گناہ ہے۔ اسی طرح کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا بھی ان کی نگاہ میں انفرادی خودی کی موت ہے۔

میں اس تمنا کی تقدیس کا اعتراف کرتا ہوں گو اس کی تحصیل کے لئے تگ و دو جاری رکھنا ایک سراب کے پیچھے بھاگنا ہے۔

س:- اس وقت ملک میں اقبال اکیڈمی، بزم اقبال اور بعض دیگر ادارے علامہ اقبال کے افکار کے فروغ کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ کیا آپ ان کی کارروائی سے مطمئن ہیں۔

جاوید اقبال:- اس مسئلے پر اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو بھی ادارے حکومت نے حضرت علامہ کے نظریات کی تشہیر کے لئے قائم کئے ہیں وہ یقینا نیک نیتی کے تحت قائم کئے گئے ہیں۔ میری دانست میں ان اداروں نے بہت حد تک اقبال کے نظریات کی تشہیر کا کام بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال اکیڈمی پاکستان اور بزم اقبال لاہور کی خدمات قابل ذکر ہیں لیکن اقبال کے افکار کی تشہیر کے سلسلے میں یہی کام ہو سکتا ہے کہ ان کے افکار کی تشہیر کے سلسلے میں اقبال شناسوں سے کتب لکھوائی جائیں یا ان کے کلام کے تراجم مختلف زبانوں میں کئے جائیں۔ علاوہ اس کے نوجوان نسل میں اقبالیات کا ذوق پیدا کرنے کے لئے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹوں میں طالب علموں کے سیمینار کرائے جائیں۔ بچوں کے لئے کتب تحریر کی جائیں۔ اچھی کتابیں لکھنے پر انعامات تقسیم کئے جائیں۔ یہ سب کام باقاعدگی سے سرانجام دیئے جائیں۔ ذاتی طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اقبال سے متعلق ان حکومتی اداروں کی کارگزاری سے مطمئن ہوں اور ان میں وسعت کی گنجائش ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان اداروں نے آپس میں کھانے پینے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ حقیقت میں اس ساری تگ و دو کے باوجود ملک میں حقیقی اقبال شناسوں کی تعداد

بہت کم ہے۔

س:- اس سلسلے میں یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا علامہ اقبال کی تعمیر ان کے خیالات اور ان کے تصورات واقعی ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کی تشریح کے لئے لاکھوں روپے کے بجٹ سے اکیڈمیاں قائم کی جائیں۔ آخر لوگ خود بھی تو پڑھ سمجھ سکتے ہیں۔

جاوید اقبال:- یہ کہنا درست نہیں کہ لاکھوں روپے کے بجٹ اقبال کے افکار کی تشہیر پر ضائع ہو رہے ہیں کیونکہ اپنے طور پر خود بھی پڑھ یا سمجھ سکتے ہیں۔ زندہ اقوام کو ایسے مشاہیر کے افکار کو فروغ دینے کے لئے ایسے اقدام اٹھانے پڑتے ہیں۔ ہم نے اب تک صحیح طور پر قومی یک جہتی پیدا نہیں کی۔ علامہ اقبال کی سب سے اہم کنٹری بیوشن مسلم قومیت کا تصور ہے اس کو فروغ دینے کے لئے اور قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لئے ہمیں مسلسل ایسے افکار کی تشہیر کرنی پڑے گی۔ علاوہ اس کے ہمارے ملک کی اساس نظریاتی ہے۔ اقبال نے اس نظریاتی اساس کی وضاحت کے لئے ایک نظام فکر قائم کر رکھا ہے۔ وہ نظام فکر ہماری نظریاتی اساس کی تعبیر کے سلسلے میں ہماری مدد کرتا ہے اور اس کی تشہیر دینا کے دیگر ممالک میں ہماری شناخت کا سبب بنتا ہے۔ آپ پاکستان کو چھوڑیں اور ذرا غور کریں۔ ہندوستان کی حکومت کیا کچھ کر رہی ہے۔ اس وقت تک چھ اقبال مرکز یا ادارے وہاں قائم کئے گئے ہیں یہ اقبال اکیڈمیاں یا انسٹی ٹیوٹس درج ذیل مقامات پر قائم ہیں۔

سری نگر۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ حیدر آباد (دکن) کلکتہ اور بھوپال۔ اس کے علاوہ جگن ناتھ آزاد جیسے بعض اقبال شناسوں نے جس جس یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہیں وہاں علیحدہ ادارے قائم کر رکھے ہیں اقبال کے افکار کی تشہیر کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی سیمینار کہیں نہ کہیں کیا جاتا ہے۔ البتہ وہ اقبال کے نظریات کی تشہیر اپنے نقطۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔

س:- ہمارے اقبال شناسوں میں یہ ایک عجیب بات ملتی ہے کہ وہ جب کبھی علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو تمام کلام کو مد نظر نہیں رکھتے بلکہ ان کے جزوی مطالعے سے اپنے مخصوص عقائد نظریات کے متعلق اشعار منتخب کر لیتے ہیں۔ ایسے اقبال شناسوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

جاوید اقبال:- میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک طرح کی دانشورانہ بددیانتی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ حضرت علامہ کے افکار و نظریات کو ان کی صحیح ہئیت میں پیش کیا جانا

چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت علامہ ایک پہلو دار شخصیت ہیں ان کے افکار بھی پہلو دار
ہیں لیکن ہم میں سے بعض نام نہاد اقبال شناسوں نے دانشورانہ بد دیانتی کا ارتکاب
کرتے ہوئے انہیں ایک معمہ بنا دیا ہے۔ معمہ کے سبب انہیں سمجھنے میں ابہام پیدا ہوتا
ہے اور صحیح و غلط خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اقبال ایک نابغۂ روزگار تھے اور نابغۂ روزگار کی
حیثیت سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکر اقبال ایک ایسا آئینہ ہے جس میں جھانکنے والے کو
وہ کچھ نظر آ سکتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ ضروری نہیں کہ
حقیقت بھی ہو۔ وہ افسانہ بھی ہو سکتا ہے ایک ایسا افسانہ جو دیکھنے والا حقیقت سمجھ کے پیش
کرتا ہے۔ خواہ وہ اپنی طرف سے دانشورانہ نیک نیتی سے پیش کرے۔

س:۔ پاکستانی قوم کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے۔

جاوید اقبال:۔ پاکستان قوم صحیح معنوں میں پاکستانی قوم بن کر دکھائے تو بات بنتی ہے۔
یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ہم اپنے آپ میں حقیقی معنوں میں قومی یک جہتی پیدا کرنے
کی کوشش کریں۔ قومی یک جہتی کو پہاڑوں کی سمت، دریاؤں کا رخ، زبان نسل، یا رنگ کا
ایک ہونا پیدا نہیں کرتے۔ لاطینی امریکہ میں بیس ملکوں کی زبان ہسپانوی ہے۔ نسل
بھی ایک جیسی ہے تمدن بھی اور جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ ملک ایک دوسرے سے
منسلک ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم نہیں ہیں۔ اسی طرح عرب ممالک بھی لسانی
نسلی یا جغرافیائی یک جہتی کے باوجود ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ عراقی، مصری، سعودی،
لبنانی، شامی وغیرہ۔ اقوام میں منقسم ہیں۔ قومی یک جہتی تب پیدا ہوتی ہے جب افراد
کے ذہنوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ ایک دوسرے کے ہیں۔ جب بھی یہ احساس
پیدا ہو جاتا ہے یا جن لوگوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے وہاں وہ لسان۔ نسل یا
جغرافیہ کے اشتراک کے باوجود ایک قوم بن جاتے ہیں۔

ہمارے اشتراک کا سبب ہمارے روحانی سطح نظر میں یکسانیت ہے۔ اگر میری قوم
کا ہر فرد اس بات کو سمجھ جائے تو پاکستان اپنے ہر مشکل مسئلے کو حل کر سکے گا۔ اس سے بہتر
اور کیا پیغام پاکستانی قوم کو دیا جا سکتا ہے۔ اتحاد، مساوات اور استحکام پاکستان ہی میں ہماری
فلاح و بہبود ہے۔

میری سیاسی زندگی

اس کے علاوہ جب مادر ملت نے ایوب خاں کے خلاف الیکشن لڑا تو میں نے
مادر ملت کے ساتھ پورے پنجاب کا سفر کیا۔ صدر ایوب خاں کے خلاف تحریک میں ہم
لوگ شامل تھے۔ مجھے مال روڈ پر ان کے خلاف جلوسوں کی قیادت بھی کرنا پڑی۔ اس
طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔

جس وقت ایوب خاں اقتدار سنبھالتے ہیں ان سے بھی میری ملاقات ہوتی ہے۔
انہی دنوں قدرت اللہ شہاب نے پاکستان رائٹرز گلڈ قائم کی۔ اس کو قائم کرنے کا مقصد
یہ تھا کہ ملک میں جو بھی ادیب ہیں، انہیں اکٹھا کیا جائے اور حکومت ان کی مدد
کرے۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ ایوب خاں کی آمریت کو سہارا دیں۔ اس میں بنگالی
ادیب بھی شامل تھے پہلے اجلاس کی صدارت ایوب خاں نے کی۔ مجھے اس اجلاس میں
کلیدی خطبہ دینے کے لیے شہاب صاحب نے کہا میرا وہ خطبہ بہت مشہور ہوا اس کا
اردو ترجمہ بھی ہوا۔ اس کا موضوع تھا کہ پاکستان میں ادیب کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔
ایوب خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں میرے خطبے کی بڑی تعریف کی اور میرے
خیالات کو سراہا۔ اس کے بعد ایوب خاں سے ملاقات ہوئی کہ انہوں نے تمام اداروں
کے بارے میں رپورٹیں طلب کیں۔ کہ ان میں کیا کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔
سکندر مرزا نے جس کمیشن کے ساتھ مجھے منسلک کیا تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔
میں اس کمیشن کے ساتھ آٹھ دس ماہ منسلک رہا۔ مگر تنخواہ نہیں لیتا تھا کیونکہ جب وہ
کمیشن کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس لیے میں نے تنخواہ لینا مناسب نہ سمجھا تو جب ایوب
خاں نے دیکھا کہ میں اس کمیشن سے منسلک رہا مگر تنخواہ کا خانہ خالی تھا تو انہوں نے
قدرت اللہ شہاب سے پوچھا کہ جاوید اقبال اس کمیشن سے منسلک تو ہیں۔ باقی حضرات
تنخواہ لے رہے ہیں مگر ان کے تنخواہ لینے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ تو پھر ان کا اس
ادارے کے ساتھ کیا تعلق ہے تو انہوں نے کہا کہ جاوید اقبال نے یہ کہا تھا کہ میں
اس وقت تک کوئی تنخواہ نہیں لوں گا جب تک ادارہ کوئی مثبت کام نہیں کرتا۔

اس سے متاثر ہو کر ایوب خاں نے شہاب صاحب سے کہا کہ مجھے ان سے ملواؤ
میں ایوب خاں سے ملا- میرے ان سے مراسم کافی عرصے تک رہے- گورنر کالا باغ
نے مجھ سے پوچھے بغیر مجھے بنیادی جمہوریت میں بطور ایک ممبر کے نامزد کر دیا-
مجھے بہت برا محسوس ہوا- میں نے کہا کہ میں کسی منتخب ادارے میں نامزدگی کا قائل
نہیں- اس لیے آپ مجھے اس میں شامل نہ کریں- میرے اس انکار سے میاں صلاح
الدین کو یہ نقصان پہنچا کہ وہ میئر لاہور کے لیے انتخاب لڑ رہے تھے- ایک ووٹ سے
ہار گئے- اس زمانے میں ایوب خان کی آمریت تھی- پنجاب کا گورنر نواب کالا باغ تھا،
جو بذات خود بہت بڑا آمر تھا- انہوں نے بہت برا منایا کہ ہم اسے نواز رہے ہیں اور
یہ اپنا رویہ اس طرح کا رکھ رہا ہے جمہوریت کی بات کر رہا ہے-

صدر ایوب نے اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے
اقتدار سپیکر کو سونپنے کے بجائے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دیا- یحییٰ خان نے آتے ہی
آئین کو ختم کر دیا، ون یونٹ کو توڑ دیا اور مغربی اور مشرقی پاکستان میں پیسٹرلی ختم کر
دی- یحییٰ خان نے جو الیکشن کروائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں کافی
عرصہ کے بعد یہ صحیح الیکشن ہوئے- بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور
اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا- ان دنوں جب کبھی بھٹو صاحب لاہور آتے تو اکثر شام کو
میرے ہاں آ جاتے اور کھانا میرے ساتھ کھاتے- ایک دو مرتبہ ان کے ساتھ غلام
مصطفیٰ کھر بھی آئے- اس زمانے میں بھٹو صاحب کی گاڑی کھر صاحب ہی چلاتے
تھے- جب یہ پارٹی بنا رہے تھے تو ان کا اصرار تھا کہ میں ان کی پارٹی میں شامل ہو
جاؤں مگر مجھے محترمہ فاطمہ جناح نے کہا تھا کہ تم بھٹو صاحب کو کہو کہ وہ مسلم لیگ میں
آئیں- ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ میں نوجوان آئیں- میں نے بھٹو صاحب کو کہا
کہ آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں یہ قائداعظم کی جماعت ہے لیکن بھٹو صاحب کے
خیال میں مسلم لیگ میں کوئی سکت نہ تھی- مسلم لیگ کے تین ٹکڑے ہو چکے تھے-
ایک کنونشن لیگ تھی جو ایوب خان کے زیر اثر تھی، دوسری کونسل لیگ جس کے ساتھ
محترمہ فاطمہ جناح کی وابستگی تھی لیکن اس وقت اس کی قیادت ممتاز دولتانہ کے ہاتھ میں
تھی، تیسری مسلم لیگ خان قیوم خان کی تھی- جہاں تک یحییٰ خان کا تعلق ہے، وہ
چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کو زندہ کیا جائے- ان کی خواہش تھی کہ قیوم خان اور ممتاز

دولتانہ میں تصفیہ ہو جائے لیکن یہ تصفیہ نہ ہو سکا- محترمہ فاطمہ جناح بھی اس ضمن میں
پریشان تھیں، وہ بھی کچھ نہ کر سکیں- بھٹو صاحب نے مسلم لیگ کے بارے میں یہی
کہا تھا کہ یہ پارٹی موثر نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے- جب مجھے بھٹو
صاحب اپنی پارٹی میں شامل ہونے کے لیے کہتے تو میرا جواب ہوتا کہ مجھے آپ کے
سلوگن اسلامی سوشلزم کی سمجھ نہیں آتی کیونکہ میرے نزدیک اسلام تمام مسائل کا حل
پیش کرتا ہے اس کے ساتھ سوشلزم کا دم چھلا لگانے کی ضرورت نہیں-

میں نے انہیں کہا کہ اسلام میں بذات خود سوشل جسٹس کا تصور ہے مگر بھٹو
صاحب نے کہا کہ یہ اصطلاح سیاسی نوعیت کی ہے اور جب تک آپ سوشلزم کا لفظ
استعمال نہ کریں بنگال کا کوئی شخص آپ کے ساتھ شامل نہیں ہوگا اور جب تک مغربی
پاکستان میں اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر نہ کرو، یہاں کوئی شخص آپ کے ساتھ
شامل نہیں ہو گا- سو میں نے دونوں علاقوں کو ساتھ ملانے کے لیے یہ اصطلاح
استعمال کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اصطلاح کے باوجود بنگال سے ایک بھی ووٹ
پیپلز پارٹی کو نہ ملا-

بہر حال اس اختلاف کی وجہ سے میں ان کی پارٹی میں شامل نہ ہوا- ویسے بھٹو
صاحب کے ساتھ میری دوستی رہی- میں اس وقت کونسل مسلم لیگ میں تھا اور اس
لیگ سے میری وابستگی محترمہ فاطمہ جناح کے زمانے ہی سے تھی-

انتخابات ہوئے- مجھے کونسل مسلم لیگ کا ٹکٹ لاہور کے حلقے کے لیے ملا-
میرے مقابلے میں میاں محمود علی قصوری نے کھڑا ہونا تھا مگر انہوں نے میرے مقابلے
میں الیکشن لڑنے کا خطرہ مول نہ لیا اور میرے مقابل بھٹو صاحب کو کھڑا کر دیا- قصوری
صاحب کا خیال تھا کہ اگر جاوید اقبال ہار گیا تو بعد میں اس سیٹ پر میں ضمنی انتخاب
میں کھڑا ہو جاؤں گا-

بیگم شاہنواز کے ذریعے ایک کوشش یہ بھی کی گئی کہ میں الیکشن خواہ کونسل
لیگ کے ٹکٹ پر لڑوں لیکن پی پی پی کا میرے ساتھ مقابلہ نہ کیا جائے اور میری وابستگی
ان کے ساتھ رہے- میں نے اس تجویز کو رد کر دیا- میں نے کہا کہ نظریاتی طور پر
میں انتخاب لڑوں گا، کسی قسم کی سودے بازی نہیں کروں گا- الیکشن میں ان دنوں پی پی
پی کے حق میں آندھی چلی ہوئی تھی- اس لیے میں بھٹو صاحب کے مقابلے میں

کامیاب نہ ہو سکا۔ اس حلقے میں بعض لوگ کبھی زندگی میں ووٹ ڈالنے نہیں گئے تھے، وہ بھی صرف میری وجہ سے ووٹ ڈالنے گئے مثلاً جسٹس منیر صاحب نے مجھے کہا کہ انہوں نے آج تک زندگی میں ووٹ نہیں ڈالا مگر میں تمہاری وجہ سے اپنے گھر کے تمام افراد کو لے کر گیا اور تمہیں ووٹ ڈالے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ اگر کسی گھر میں ملازم تھے تو ملازموں نے بھٹو صاحب کو ووٹ دیا اور گھر کے مالکان نے مجھے ووٹ ڈالا۔ لاہور میں، میں ہی ایک امیدوار تھا جس کی ضمانت ضبط نہیں ہوئی ورنہ باقیوں کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ میرے 46 ہزار ووٹ تھے اور بھٹو صاحب کے غالباً 64 یا 65 ہزار تھے۔ بھٹو صاحب اس حلقے سے کامیاب ہوئے۔ میرے بارے میں لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ یہ شریف آدمی ہے اور اسی شرافت کی وجہ سے انہوں نے مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ مجھے منتخب کرتے۔

ہنری کسنجر لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں گورنر ہاؤس میں دعوت تھی۔ اس میں بھٹو صاحب نے لاہور کے شہریوں کا شکریہ ادا کیا اور فخر سے کہا کہ آپ نے میرے مقابلے میں علامہ اقبال کے بیٹے کو شکست دی۔

الیکشن کے بعد بھی بھٹو صاحب سے میری ملاقات ہوتی رہی۔ میں ان دنوں وکالت کرتا تھا اور ساتھ ساتھ لاء کالج میں جزوقتی لیکچرار تھا۔ 56ء سے 70ء تک میں لاء کالج میں پڑھاتا رہا۔ الیکشن ختم ہونے کے اگلے ہی روز جسٹس سجاد احمد جان میرے گھر آئے یہ اس وقت سپریم کورٹ کے جج تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ دیکھ کر قلق ہوتا ہے کہ آپ سیاست کے کیچڑ میں اپنے آپ کو ملوث کئے ہوئے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم جوڈیشری میں آ جاؤ۔ چیف جسٹس انوارالحق صاحب ججوں کے لیے نام بھیج رہے ہیں۔ اگر آپ اتفاق کریں تو آپ کا نام بھی بھیج دیا جائے۔ ان دنوں گورنر عتیق اور صدر یحیی خان تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ سوچ کر بتاؤں گا کیونکہ مجھے اس سے قبل تین مرتبہ جج بننے کے لیے کہا گیا۔ ایک تو 60ء میں ایوب خان کے زمانے میں جب جسٹس کیانی صاحب چیف جسٹس تھے حالانکہ اس وقت میری عمر 38 برس تھی جبکہ جج بننے کے لیے عمر 40 برس ہونی چاہئے۔ 64ء میں مادر ملت کے ایوب خان کے مقابلے کے موقع پر پھر ایسی کوشش کی گئی۔ اس وقت چیف جسٹس انعام اللہ خان صاحب تھے۔ جسٹس کیکاؤس جو میری بیوی کے خالو تھے، ان کے ذریعے مجھ سے رابطہ

جاوید اقبال امریکہ کے شہر ہوسٹن میں جدید اسلامی ریاست کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔

کیا گیا، اس وقت بھی میں نے انکار کیا۔ جب تیسری مرتبہ جسٹس سجاد احمد جان آئے تو میں نے سوچا کہ سیاست میں، میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کر سکوں گا کیونکہ اس دوران ملک کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ میرے الیکشن میں زیادہ بھاگ دوڑ نواز شریف صاحب کے والد میاں شریف صاحب نے کی تھی۔ اس کا بعد میں انہیں نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

میں نے سجاد احمد جان صاحب کی تجویز کو قبول کیا اور جوڈیشری میں آنے کی حامی بھر لی۔ جسٹس انوارالحق نے میرا نام بھیجا اور گورنر عتیق نے اس کی منظوری دی۔ جنرل یحیی کو یہ بات پسند نہ آئی کہ میں جج بنوں بلکہ انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور کہا کہ آپ کیوں جوڈیشری میں جا رہے ہو، میں چاہتا ہوں آپ سیاست ہی میں رہیں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ الیکشن کراؤں جو پاکستان کی بنیاد پر ہوں کیونکہ پہلے الیکشن سے تو ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اس لیے پہلے الیکشن اب ختم ہو گئے ہیں۔

میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے آپ کو اس سیاست کے قابل نہیں سمجھتا اور میں اب جوڈیشری ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے۔ میں نے یحیی خان سے کہا کہ اگر دونوں اکٹھی ہو جائیں پھر تو میں جسٹس انوارالحق صاحب سے کہہ دوں گا کہ وہ میرا نام واپس لے لیں۔ کچھ دنوں کے بعد اس سلسلے میں کوشش بھی کی گئی۔ یوسف خٹک صاحب آئے، مجھے بھی ملے، ان کے ساتھ مجید نظامی صاحب تھے۔ میرا جواب یہی تھا کہ اگر دونوں اکٹھی ہو جائیں تو میں سیاست میں واپس آنے کو تیار ہوں۔ وہ مجھے کہہ تو گئے کہ آج شام کو میں آپ کو فون کروں گا لیکن بات نہ بن سکی اور ان کے اکٹھے ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ میرے الیکشن کے دوران میں آغا شورش کاشمیری اور مجید نظامی صاحب نے بھی میری مدد کی بلکہ انہی کے ذریعے میں مولانا مودودی کو بھی ملا۔ میں مودودی صاحب کا احترام کرتا ہوں۔ اور ان کی سیاست سے تو میرا تعلق نہ رہا۔ جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے، میں نے ان کا ہمیشہ احترام کیا۔ انہوں نے بھی اپنے طور پر میری مدد کی۔ پھر ہم نے کوشش کی کہ میرے مقابل جو جنرل سرفراز پی ڈی پی کی طرف سے کھڑے تھے یہ بیٹھ جائیں اور مقابلہ صرف دو افراد کے درمیان ہو لیکن وہ نہیں مانے۔ اس زمانے میں جو پرانے احراری علماء ان کے ساتھ تھے، ان کی تقاریر کا طریقہ میرے خلاف ہی ہوتا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ علامہ

اقبال کا بیٹا اسی طرح کا ہے جیسے حضرت نوح کا نافرمان بیٹا تھا کیونکہ جو علامہ اقبال مسجد تھی اس مسجد کی تعمیر دوبارہ کرا کے ہم نے مسجد کو اوپر کی منزل پر کر دیا تھا اور نیچے دکانیں بنا دی تھیں تاکہ ان دکانوں کی آمدنی سے مسجد کا خرچ چلے اور خیرات پر نہ چلے۔ ان علماء کے نزدیک میرا یہ قدم درست نہیں تھا۔ اس لیے مجھے نافرمان بیٹا کہا گیا۔ بہرحال اکٹھی نہ ہو سکیں اور میں جولائی 71ء میں ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔

میں نے جاوید اقبال صاحب سے پوچھا کہ آپ مولانا مودودی صاحب سے ملے۔ کیا کبھی غلام احمد پرویز صاحب سے بھی ملاقات ہوئی؟

تو جسٹس جاوید اقبال صاحب نے فرمایا۔ میری غلام احمد پرویز صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا۔

کینیڈا کے ایک سکالر نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا موضوع ہے "علامہ اقبال کے بعد پاکستان میں مذہبی فکر"۔ اس میں اس نے تین شخصیات کو لے کر بحث کی ہوئی ہے۔ جو یہ ہیں۔ مولانا مودودی، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم۔ ان تینوں کے متعلق اس نے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ نتیجہ یہ نکالا ہے کہ علامہ اقبال کے اسلامی معاشرے کے احیاء کے سلسلے میں جو تصورات ہیں، ان کی اپنی اپنی تاویل یہ اصحاب پیش کر رہے ہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ یہ شخصیات علامہ اقبال کے فکر کی صحیح وضاحت شائد نہیں کر پائے۔ علامہ اقبال کے مسئلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اس لیے علامہ کے خیالات کو ہر شخص اپنے رنگ میں پیش کرتا رہا ہے مثلاً پیپلز پارٹی کے گذشتہ دور میں علامہ اقبال کو سوشلسٹ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ جب علامہ اقبال علماء کے ہاتھ میں آجاتے ہیں تو وہ انہیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ علامہ اقبال جیسا قدامت پسند اور کوئی نہیں۔ کسی زمانے میں ایسے ہی علماء علامہ اقبال پر کفر کے فتوے بھی لگاتے تھے۔ اب علماء کا کوئی بھی خطبہ منبر پر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک علامہ اقبال کے شعروں کا حوالہ نہ دیں۔ لوگ علامہ اقبال کے شعر تو پڑھتے ہیں مگر ان کی نثر کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ دراصل اپنے فکر کی وضاحت انہوں نے اپنی نثر میں کر رکھی ہے۔ گذشتہ دنوں سٹاف کالج میں مسلم ریاست کے تصور پر میرا لیکچر تھا۔ جب سوال جواب کا مرحلہ

آیا تو ایک صاحب جو روایتی نقطہ نظر رکھتے تھے، انہوں نے کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے بغیر کسی ثبوت کے کہا ہے کیونکہ آپ نے علامہ کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔ اس لیے کیا ہم اس کو محض اس لیے درست تسلیم کر لیں کہ آپ اقبال کے فرزند ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ لیکچر میں تو حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔

میرا لیکچر پمفلٹ کی شکل میں جو آپ کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں تمام حوالے درج ہیں۔ کم از کم آپ نے اس کا تو مطالعہ کر لیا ہوتا۔ میں اپنی طرف سے بھی یہ کوشش کرتا ہوں کہ علامہ کا فکر صحیح طور پر پیش کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ مجھ سے سبھی اتفاق کریں۔ اس مین اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال یحییٰ خان کے دور میں، میں جج بنا مگر کنفرم بھٹو صاحب نے کیا کیونکہ اس وقت بھٹو صاحب وزیراعظم تھے۔ جب میری کنفرمیشن کا کیس بھٹو صاحب کے پاس گیا تو بھٹو صاحب نے آغا شورش کاشمیری کے ذریعے کہلا بھیجا کہ انہیں کہو کہ بند کمرے میں بیٹھ کر فریقین کے فیصلے کرنے کے بجائے باہر آ کر قوم کے فیصلے کریں مگر میں نے آغا صاحب کو انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب نے جب دیکھا کہ میں سیاست میں آنے کا خواہش مند نہیں تو انہوں نے مجھے بطور جج کنفرم کر دیا۔

انہی ایام میں، میں ایران گیا۔ شاہ کا زمانہ تھا، شاہ سے ملاقات بھی ہوئی۔ وہاں اصفہان یونیورسٹی میں علامہ اقبال پر لیکچر دیا، ترکی بھی گیا۔ وہاں مولانا رومی کے مزار پر حاضری دی۔ قونیہ میں مولانا روم اور علامہ اقبال پر لیکچر دیئے۔ قونیہ میں جہاں مولانا روم کا مزار ہے اس کے احاطے میں انہوں نے علامہ اقبال کی فرضی قبر بنائی ہوئی ہے۔ وہاں باقاعدہ فاتحہ بھی پڑھی جاتی ہے کیونکہ علامہ اقبال مولانا روم کے مرید تھے لہٰذا ترکوں نے محبت کے اظہار کے طور پر ان کی فرضی قبر مولانا روم کے احاطے ہی میں بنائی ہوئی ہے۔ اسی جگہ ان کا ایک شاعر عاطف بھی دفن ہے کیونکہ وہ بھی اسلامی شاعر تھا۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے جاوید اقبال فلسطین کے مسئلہ پر پاکستان کا موقف پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان کے حکمران۔ ذاتی تاثرات

اپریل 1957ء میں اقبال اکیڈمی نے مجھے یوم اقبال کے موقع پر خطاب کے لیے بلایا۔ ان دنوں اقبال اکیڈمی کا دفتر کراچی میں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اقبال کے حوالے سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا میری یہ تقریریں کتابی شکل میں "مئے للہ فام" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے سب سے پہلے اس موضوع پر تقریر کی "اسلام میں وسیع النظری کی تحریک اور علامہ اقبال" عجیب و غریب بات ہے کہ اس جلسے میں بعض ایسی شخصیات جن کو میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا وہ خاص طور پر جلسے میں اس لیے آئی تھیں کہ میرے بحیثیت فرزند اقبال کیا خیالات ہیں جبکہ میں کیمبرج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے واپس آیا ہوں۔ ان میں ایک تو سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے میاں افتخار الدین مرحوم تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ہم صرف تمہاری تقریر سننے آئے ہیں۔ جب میں تقریر کر چکا تو یہ دونوں حضرات اٹھ کر چلے گئے۔ میری اس تقریر کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی تو اس تقریر کے حوالے سے صدر سکندر مرزا نے مجھے بلا بھیجا کہ میں ان سے ملوں۔ یہ پیغام مجھے قدرت اللہ شہاب نے پہنچایا۔ میری شہاب صاحب سے دوستی بھی تھی۔ میں کراچی پہنچا۔ تین چار روز کراچی رہا تو تقریباً روزانہ ہی سکندر مرزا سے ملاقات ہوتی رہی۔ اسی طرح ایک عشائیہ میں میری ملاقات پرنس علی خان سے ہوئی یہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ سکندر مرزا نے کہا کہ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم انگلستان سے تعلیم مکمل کرکے آئے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ملک کے لیے استعمال کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایڈیشنل سیکرٹری کے طور پر بغداد پیکٹ کے ساتھ منسلک کرکے بغداد بھیج دیا جائے۔ یہ پیکٹ امریکہ کی شہ پر بنایا گیا تھا اور روس کے خلاف ایک طرح کا محاذ تھا۔ اس میں یہ ممالک پاکستان، ایران، عراق اور ترکی شامل تھے۔ یہ ایک طرح کا ملٹری پیکٹ تھا۔ میں نے سکندر مرزا کو جواب دیا کہ میں چھ سات برس بعد ملک میں واپس آیا ہوں، اگر میں دوبارہ ملک سے باہر

چلا گیا تو میں اپنے ملک میں جڑیں مضبوط نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے میں ملک میں رہنا چاہتا ہوں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر تم ملک ہی میں رہنا چاہتے ہو تو کس قسم کا کام کرنا پسند کرو گے۔ میں نے جواب دیا کہ 1956ء کے آئین کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے لیے کمشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے آپ اگر پسند فرمائیں تو مجھے اس کے ساتھ منسلک کر دیجئے۔ ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی کارآمد خدمت سرانجام دے سکوں۔ یہ سن کر سکندر مرزا ہنس پڑے اور کہنے لگے، وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں کیونکہ دراصل کمیشن نے نہ تو کوئی کام کرنا ہے نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے، بہرحال اگر تمہاری خواہش یہی ہے تو میں تمہیں اس کے ساتھ منسلک کئے دیتا ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ جب انتخاب ہوں گے تو ان میں تم حصہ لو گے۔ میں ان کی گفتگو سے حیران ہو گیا کیونکہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس اس تعیش کے لیے وسائل موجود نہیں لیکن وہ اصرار کرنے لگے اور کہا کہ تم جس سیاسی جماعت کا ٹکٹ چاہو اس کا انتظام کرا دیا جائے گا۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ میں بظاہر مسلم لیگ سے اپنے آپ کو وابستہ رکھوں۔ لیکن درحقیقت اپنے محسن کا فرمانبردار رہوں۔ اس ملاقات میں مجھے نہایت مربیانہ انداز میں یہ سبق دیا گیا تھا کہ سیاسیات پاکستان میں کسی اصول کی پابندی ملحوظ خاطر رکھنا پرلے درجے کی حماقت ہے یہاں اگر اندرون تاریک رہے تبھی کرسی اقتدار مضبوط رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سازش اور عیاری کا تقاضا یہی ہے کہ ملک میں ایسی صورتحال مستقل طور پر قائم رکھی جائے جس میں دوسرے تم پر انحصار کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ یوں تم ایسے مقام پر پہنچ سکتے ہو کہ اپنی خوشی کے مطابق جسے چاہو حربے کے طور پر استعمال کرو اور جو استعمال کے قابل نہ رہے اس سے یوں قطع تعلق کرو جیسے وہ تھا ہی نہیں بلکہ اس کا نام و نشان تک مٹا دو۔ میں سکندر مرزا کے سیاسی مکتبہ فکر کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ علاوہ اس کے جس گھر کا میں چراغ تھا اس کی روایات قطعاً مختلف تھیں۔ ظاہر ہے قصر صدارت کراچی سے دلبرداشتہ رخصت ہوا۔ اس کے ایوانوں سے گزرتے وقت مجھے قائداعظم کا خیال آگیا۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

بات یہ نہیں کہ میں سکندر مرزا جیسے پیشوایان سیاست سے ملتا نہیں رہا۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں اور اپنی بھی سناتا رہا ہوں لیکن میری طرح انہیں بھی احساس ہے کہ جب ضمیر فروشی کا معاملہ آیا ہے تو علامہ کے ارشادات اچانک مجھے زنجیروں کی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض سے میں وقتی طور پر متاثر بھی ہوا ہوں یا توقعات وابستہ کی ہیں لیکن ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس امید سے کہ شاید ان کے ہاتھوں ملک میں ایک صالح سیاسی نظام کا نفاذ ہو سکے۔ جس کے ذریعے ملک کی فلاح و بہبود کے امکانات پیدا ہو جائیں۔ گر ان کی ذات میں جن صفات کے دیکھنے کی آرزو کرتا رہا وہ نظر نہ آئیں اور مجھے بہ امر مجبوری یہ کہہ کر کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے نور گفتار واہی

اس کے بعد عجیب و غریب صورت یہ ہوتی ہے کہ 58ء میں جس وقت غالباً خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے ایک جلوس نکالا جس کے متعلق مشہور یہ ہوا کہ وہ 32 میل لمبا تھا۔ جس سے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ سکندر مرزا خائف ہو گئے۔ اس طرح ان کا ارادہ جو انتخابات کرانے کا تھا ری پبلکن پارٹی بمقابلہ مسلم لیگ تو انہوں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ انہوں نے وزارت ختم کر دیں۔ اس وقت فیروز خان نون وزیر اعظم تھے۔ تمام اختیارات انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ایوب خان کو ساتھ شامل کر لیا۔ نتیجتاً 1956ء کے آئین کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایوب خان نے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور پھر وہ صورت ہوئی کہ ملک میں پہلا مارشل لاء لگا جس کو 58ء کا مارشل لاء کہتے ہیں۔ بعد میں سپریم کورٹ نے قانونی طور پر اسے ایک طرح کی سند دے دی۔

سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر انقلاب کامیاب ہو اور لوگ اسے قبول بھی کر لیں تو وہ بجائے خود ایک نیا قانونی نظام نافذ کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

اسی دوران مجھے کینبرا یونیورسٹی (آسٹریلیا) میں لیکچروں کے لیے بلوایا گیا کچھ پروفیسر جو میرے ساتھ کیمبرج میں تھے۔ اس تعلق کی بناء پر مجھے انہوں نے بلوایا کہ

ہم ایک کانفرنس کر رہے ہیں۔ اس میں آپ بھی شامل ہوں۔ موضوع تھا "ایشیا میں دستوریت کا مستقبل" مجھے کہا گیا کہ آپ مقالہ لکھ کر لائیے جس کا موضوع ہو پاکستان میں اسلامی ریاست کس شکل میں قائم ہو گی۔ میں اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آسٹریلیا چلا گیا۔ یہ جولائی، اگست 60ء کا واقعہ ہے۔ یہ میری بیرون ملک پہلی کانفرنس تھی جس میں، میں نے شرکت کی۔ میں نے وہاں "پاکستان میں اسلامی ریاست کی تلاش" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ یہ نہیں کہ وہ قائم ہو گئی ہے کہ ہم کسی مرحلے پر قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے بلکہ ہم اس کی تلاش ہی کرتے رہیں گے۔ بعد میں میرا مقالہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ میرا مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم نے مجھے کہا کہ پاکستان پر لیکچروں کا سلسلہ جاری کرو۔ سڈنی اور ملبورن میں بھی پاکستان کے موضوع پر لیکچر دو۔ میں ہی اکیلا پاکستانی اس سیمینار میں شریک تھا۔ اس کانفرنس کا تعلق جنوبی ایشیاء سے تھا میں نے یہ لیکچر دیئے۔ ملک میں کیونکہ آمریت تھی اور میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ اسی لیے یہی انداز رکھا کہ یہ وقتی دور ہے اور یہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ ہماری قوم کا مزاج جمہوریت کی طرف ہے۔ میں ابھی سڈنی ہی میں تھا کہ پاکستانی ہائی کمشنر نے مجھے اطلاع دی کہ آپ کو اقوام متحدہ میں بحیثیت پاکستان مندوب کے بھیجا جا رہا ہے۔ اس لیے آپ جلد پاکستان پہنچیں۔ انہوں نے کہا کہ وزیر خارجہ منظور قادر کا فون آیا ہے۔ سو منظور قادر کے ٹیلیفون کی بناء پر میں نے اپنے لیکچروں کا سلسلہ مختصر کیا اور کراچی فارن آفس پہنچا سیکرٹری خارجہ اکرام اللہ صاحب سے ملا۔ مجھے انہوں نے تفصیل بتائی اور کہا کہ آپ اسلام آباد تشریف لے جائیں صدر ایوب خان بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں کراچی سے لاہور آیا اور پھر اسلام آباد گیا وہاں ایوب خان سے ملاقات ہوئی۔ ایوب خان نے مجھے کہا کہ تم کہیں اس بات سے ناراض تو نہیں ہو گئے تھے کہ تمہیں گورنر امیر محمد خان نے بنیادی جمہوریت میں ممبر نامزد کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے یو این او اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ کہیں میں ناراض تو نہیں ہو گیا۔ مجھے ایوب خاں نے کہا کہ اس بار جو وفد جا رہا ہے اس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کریں گے۔ آپ ان کے ساتھ جائیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پہلے آپ دونوں ترکی جائیں۔

جن دنوں بھٹو صاحب آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے میں کیمبرج میں

تھا۔ ہم یوم پاکستان کی تقریبات میں لندن میں اکٹھے ہوتے تھے۔ اس وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں کراچی پہنچا پھر بھٹو صاحب اور میں اکٹھے ہی ہوائی جہاز میں پہلے استنبول پہنچے۔ پھر انقرہ آئے۔ وہاں جمہوریت ختم ہو گئی تھی اور جنرل گرسل نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی یہ کوشش تھی کہ وہاں اپنا کوئی اثرورسوخ جمائے اور ترکی کے ساتھ وقتی طور پر ہمارا رابطہ ختم ہو گیا تھا کیونکہ ہمارا تعلق تو گذشتہ حکومت کے ساتھ تھا۔ اس لیے پاکستانی حکومت کی کوشش تھی کہ ہندوستان کا اثرورسوخ ختم کرنے کے لیے وہاں کسی وزیر کو بھیجا جائے جو نئی حکومت کے ساتھ مذاکرات کرے۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ذمے یہی ڈیوٹی لگائی گئی کہ انہیں گرسل سے مل کر صدر ایوب کے دورے کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا۔ مجھے یہ کہا گیا کہ آپ پاکستان کے جو تعلقات تاریخ میں ترکی کے ساتھ رہے ہیں اس کے متعلق لیکچر دیں۔ سو میں نے ان دنوں ترکی میں دو تین لیکچر دیئے۔ ایک انقرہ اور دو استنبول میں لیکچر دیئے۔ جو بہت کامیاب رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور میں ترکی سے لندن پہنچے لندن سے آخرکار نیویارک پہنچے اقوام متحدہ کے سیشن میں میرا پہلی مرتبہ جانا ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ قائم رہا۔

امریکہ کی یونیورسٹیوں، لندن، کیمبرج، بون اور استنبول میں مزید نظریہ پاکستان کے موضوع پر لیکچر دیئے۔ بعد میں میکسیکو بھی گیا۔ وہاں میں نے تین ماہ لیکچر دیئے۔ موضوع اسلامی تمدن تھا۔ اس کے بعد پاکستان آیا تو میں نے ایوب خاں کو رپورٹ دی کہ مجھے میکسیکو میں وہاں کے صدر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو پہلی مرتبہ پاکستان کے متعلق علم ہوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ہمارے تجارتی اور دیگر مراسم بھی ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ تمہارا واشنگٹن میں جو سفیر ہے وہ سال میں ایک بار یہاں آتا ہے اور اس کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت واشنگٹن میں ہمارے سفیر عزیز احمد تھے۔ میں نے رپورٹ میں لکھا کہ ہمیں میکسیکو میں علیحدہ سفیر مقرر کرنا چاہیئے۔ بھٹو صاحب نے بطور وزیر خارجہ اس کی منظوری بھی دی۔ جب ایوب خاں سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہاں وزیر خارجہ کا بھی یہی خیال ہے .لیکن اس کی مخالفت شعیب صاحب نے کی جو اس زمانے میں

وزیر خزانہ تھے۔

غالباً امریکہ کے مفاد میں یہ نہیں تھا کہ پاکستان لاطینی امریکہ سے تعلقات ان کی خوشنودی کے بغیر استوار کرے۔ اس لیے اس وقت وہاں سفارت خانہ کھل نہ سکا۔ بعد میں جب بھٹو صاحب وزیراعظم بنے تو انہوں نے پہلی مرتبہ وہاں سفیر بھیجا۔ 1963ء میں مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا۔ چین میں مجھے بھٹو صاحب نے بھیجا جب وہ وزیر خارجہ تھے۔ وہاں چواین لائی اور ماوزے تنگ سے ملاقات ہوئی۔ 15 دن کا دورہ تھا۔ ایک دلچسپ واقعہ جو چواین لائی کے ساتھ پیش آیا۔ وہ یہ کہ دوران گفتگو میں نے ان سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ چین اور روس کی آپس میں دوستی ہو جائے کیونکہ دونوں ایک ہیں اور یہ تیسری دنیا کے ممالک کے لیے بہت فائدہ مند صورت ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ کسی سے یہ سننا پسند کریں گے کہ ہندوستان اور پاکستان کی آپس میں صلح ہو جائے۔ تو وہ بھی بڑی فائدہ مند ہو سکتی ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی تو تھے۔ میں نے چواین لائی کو کہا کہ میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا کیونکہ اب ہم ایک نہیں ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم بھی ایک نہیں ہیں اس لیے اس صورت کو کوئی چینی پسند نہیں کرے گا۔ 1964ء میں میری شادی ہوئی۔ میری بیوی ناصرہ، ڈاکٹر عبدالوحید صاحب آف فیروز سنز کی بیٹی ہیں اور ان سے میری پہلی مرتبہ ملاقات نیویارک میں 1962ء میں ہوئی تھی کیونکہ وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنے والد کے ساتھ یواین او آئی تھیں ہمیں ایک دوسرے کو ملنے اور جاننے کے مواقع وہیں ملے۔ جب وہ لاہور واپس آئیں تو ہماری شادی ہو گئی۔ انگلستان میں تعلیم کے دوران اور بعد ازاں امریکہ یا میکسیکو میں رہائش کے دوران کئی یورپین خواتین کو ملنے اور جاننے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے کسی انگریزی یا امریکی خاتون سے شادی نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ ہمارے تمدنوں میں بہت فرق ہے۔

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس کی بناء پر صدر ایوب سے میں برگشتہ ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس شیخ خورشید احمد آئے جو ان دنوں وفاقی وزیر قانون تھے۔ انہوں نے کہا کہ نواب کالاباغ آپ کو مغربی پاکستان کا وزیر قانون بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ تجویز ان کی اپنی ہے یا صدر ایوب نے کہا ہے کیونکہ صدر

نے تو مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔

میں نے خورشید صاحب کو کہا کہ میں صدر ایوب سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ خورشید صاحب نے نواب کالا باغ کو اسی طرح جا کے بتا دیا تو نواب کالا باغ ناراض ہوئے کیونکہ ان کے زمانے میں کوئی شخص ایوب خاں سے براہ راست تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ نواب کالا باغ نے پیچ و تاب کھایا کہ یہ کون ہے جو پہلے صدر سے پوچھے گا، پھر مجھے بتائے گا۔ اس طرح یہ قصہ ختم ہوگیا۔

بعد میں اخبار نویسوں نے نواب کالا باغ سے پوچھا کہ سنا ہے آپ جاوید اقبال کو وزیر قانون بنا رہے ہو تو اس نے جواب دیا نہیں ہمارا ایسا کوئی خیال نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ میں نامزدگی کو پسند نہیں کرتا۔ تو ہم انکے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں لیکن میں جب صدر ایوب خان سے ملا تو میں نے ان سے ساری تفصیل بیان کی اور پوچھا کہ کیا یہ آپ کی تجویز تھی۔ صدر ایوب نے خان نے جواب دیا کہ میں نے اس قسم کی کوئی تجویز نہیں دی۔ میں حیران ہوں کے نواب کالا باغ نے آپ کو کس طرح پیش کش کی کیونکہ ہم تو مکاروں (راسکلز) کی تلاش میں ہیں، تم تو ماشاءاللہ راست باز (اپ رائٹ) قسم کے شخص ہو تمہیں وزیر کون لے سکتا ہے۔ اس سے میرا دل پژمردہ ہوا۔ میں نے ایوب خاں کو جواب دیا کہ کیا ہماری حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے بھی جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم کتنے مکار ہیں۔ اس وجہ سے میرا دل ان سے اکھڑ گیا۔

پھر میں نے وکالت کی طرف توجہ دی۔ میں 68ء میں بار کا صدر منتخب ہوا۔ پاکستان بار کونسل کا بھی ممبر بنا۔ جناب بھٹو صاحب اس زمانے میں گرفتار ہوئے۔ میاں محمود علی قصوری ان کا کیس لڑ رہے تھے اور میں نے قصوری صاحب کو اسسٹ کیا۔ میرے ساتھ ذکی الدین پال بھی اسسٹ کر رہے تھے۔ مولوی مشتاق ان دنوں جج تھے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو رہا کر دیا۔ اسی زمانے میں ہم نے ائیر مارشل اصغر خان کو بار میں بلوایا۔ بعد میں ان کا موچی دروازے میں جلسہ کرایا۔ میں مجید نظامی اور آغا شورش کاشمیری نے ان کے جلسے کا انتظام کیا۔ یہ ایوب خاں کے خلاف تحریک تھی۔

دورۂ ترکی

میں کئی بار ترکی کے شہر قونیہ جا چکا ہوں جتنی بار بھی قونیہ گیا میں نے مولانا جلال الدین رومی کے مزار پر حاضری ضرور دی ہے مولانا رومی علامہ اقبال کے روحانی مرشد ہیں۔ علامہ اقبال کو اپنی زندگی میں یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی کہ وہ مولانا رومی کے مزار پر حاضری دے سکتے بحیثیت مرید اپنے کلام مثلاً جاوید نامہ میں حضرت علامہ نے مولانا رومی کی معیت ہی میں مختلف سیاروں کی سیر کی ہے۔ جس طرح دانتے کو شاعر ورجل آسمانوں میں لے کر پھرتا ہے اسی طرح علامہ اقبال نے مولانا رومی کو اپنا راہبر تسلیم کیا ہوا ہے جو ان کو آسمانوں پر مختلف مقامات پر لے کر جاتے ہیں۔ علامہ جہاں بھی مولانا سے سوال پوچھتے ہیں وہ ان کی تشریح کرتے ہیں۔

میں جب بھی مولانا رومی کے مزار پر جاتا سوچتا ہوں کہ یہ آخری بار آیا ہوں۔ آئندہ موقع نہیں ملے گا لیکن کوئی نہ کوئی سبب ایسا بن جاتا ہے کہ مجھے قونیہ رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس مرتبہ پاک ترک کلچرل ایسوسی ایشن کی دعوت پر ترکی گیا تھا اس کے سربراہ ڈاکٹر محمد اوندر ہیں۔ یہ خود بھی مولانا روم کی اولاد میں سے ہیں۔ ترکی دعوت کا ایک مقصد تو ان کا یہ تھا کہ مجھے سلجوق یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملنی تھی۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ وہاں مولانا رومی انٹرنیشنل کانگرس کا اہتمام کیا گیا تھا میں نے اس کانفرنس میں مقالہ پڑھا۔ سلجوق یونیورسٹی کے ریکٹر خلیل جن نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اقبال بیسیویں صدی کے مولانا روم ہیں۔ انھوں نے مجھے ڈگری عطا کرنے کے سبب یہ بتایا کہ میں نے ترک اسلامی تہذیب کی بہتر تفہیم کے لیے ادبی خدمات انجام دی ہیں اب ترک اسلامی تہذیب کی اصطلاح سے ایک بات عیاں ہوتی ہے کہ اس میں ترکی قومیت مقدم ہے اور اسلام بعد میں آتا ہے گویا کہ ان کے نزدیک قومیت کی عقیدے سے زیادہ اہمیت ہے سلجوق یونیورسٹی کی طرف سے مولانا روم پر کام کرنے والی مختلف شخصیات کو اس اعزازی ڈگری سے نوازا جا چکا ہے ان میں ڈاکٹر این میری شمل، فرانس کی مشہور سکالر (اب مسلمان ہو چکی

ہیں) مادام میرووچ حوا (پہلے ان کا نام ایوا تھا) شامل ہیں بحیثیت پاکستانی شاید میں پہلا شخص ہوں جسے اس اعزازی ڈگری سے نوازا گیا ہے۔

ترکی میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ و طالبات محنت کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ سیاست میں ملوث ہوں یا ان میں تشدد کا رجحان ہو۔ قونیہ اناطونیہ میں واقع ہے یہاں اسلام کا کافی اثر ہے ایک طرح کا وہاں اسلام کا احیا ہو رہا ہے مولانا روم کانگرس میں زیادہ تر یورپ کے سکالر شریک ہوئے جو مولانا روم کی شاعری پر دسترس رکھتے ہیں اسلامی ممالک میں سے مصر کے ایک دو سکالر شریک ہوئے پاکستان سے میں اکیلا تھا۔ مولانا روم کا سارے کا سارا کلام فارسی میں ہے۔ ترکوں نے رسم الخط بھی بدل دیا ہے اور زبان بھی ترکی ہے اس لیے وہ مولانا کے کلام کو سمجھنے سے قاصر ہیں کانگرس تین دن جاری رہی مولانا کی سوانح حیات ان کے بیٹے سلطان ولا نے تحریر کی تھی۔ جو مستند سمجھی جاتی ہے مولانا کے پوتے نے مولوی سلسلہ درویشوں کا شروع کیا اس میں سماع کی بڑی اہمیت ہے مولانا رومی کی زندگی کا اہم واقعہ ان کی شمس تبریز سے ملاقات ہے واقع یہ ہے کہ مولانا روم مفکر اور فلسفی تھے اور ہمیشہ فلسفے کی تعلیم دیتے تھے جہاں ان کا مزار ہے وہیں ان کا مکان تھا وہیں تالاب کے کنارے بیٹھ کر وہ درس دیا کرتے تھے کتابیں بھی ساتھ رکھتے تھے شمس تبریز ایک روحانی شخصیت تھے یہ ادھر سے گذرے اور مولانا رومی کو کہنے لگے کہ یہ تم کیا پڑھا رہے ہو بڑی حقارت سے انہوں نے یہ الفاظ کہے مولانا نے بھی حقارت سے جواب دیا یہ تمہاری سمجھ کی بات نہیں ہے۔ مولانا نے سمجھا کہ ایسے ہی کوئی پاگل سا شخص ہے اس کو ان چیزوں کا کیا پتہ ہے اس پر شمس تبریز نے ایک نگاہ کتابوں پر ڈالی اور ساری کتابیں حوض میں گر گئیں اور گیلی ہو گئیں۔ اس پر مولانا روم نے ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا یہ تمہاری سمجھ کی بات نہیں ہے اس کے بعد کتابیں پانی سے باہر نکل آئیں اس واقعہ سے یہ مشہور ہے کہ مولانا کو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عقل کے ذریعے انسان کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا بلکہ عشق کے ذریعے ہی حاصل کر سکتا ہے اس لیے مولانا اپنے کلام میں اکثر جگہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عقل شیطان کی طرف سے ہے اور عشق آدم یا انسان کی طرف سے اس طرح مولانا کا خاص تعلق شمس تبریز کے ساتھ پیدا ہوا۔ انہوں نے عقل کا راستہ چھوڑ کر عشق کا راستہ اختیار
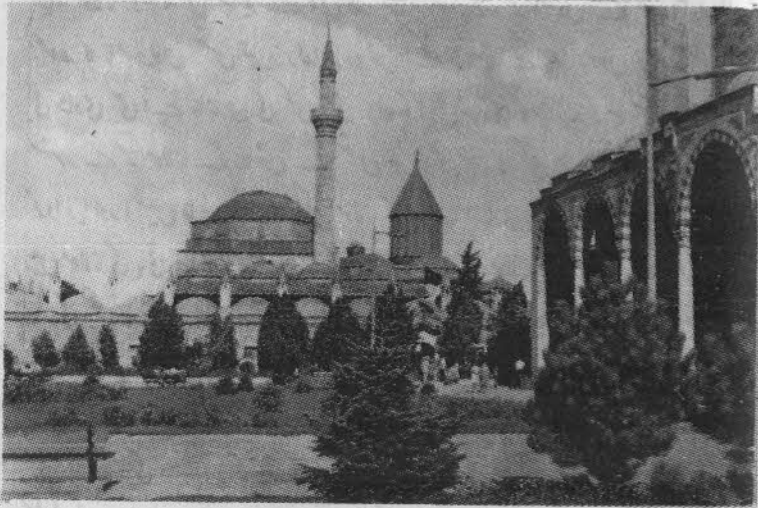
مولانا جلال الدین رومی کی تربت قونیہ میں

مولانا رومی انٹرنیشنل کانگرس سے جاوید اقبال خطاب کر رہے ہیں۔

کیا۔ مولانا روم شمس تبریز سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ انہوں نے خود اشعار لکھ کر مجموعہ کا نام دیوان شمس تبریز رکھا یہ دونوں اکٹھے رہتے تھے پھر انہوں نے شمس تبریز کی شادی بھی اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے کرادی شادی کامیاب نہ ہوسکی عام بات یہ مشہور ہے کہ مولانا کے بیٹوں نے شمس تبریز کو کسی نہ کسی طرح سازش کر کے قتل کروا دیا اور انہیں غائب کر دیا لیکن مولانا کو صرف اتنا ہی بتایا گیا کہ وہ غائب ہو گئے ہیں مولانا کی باقی ساری زندگی ان کے فراق میں گزری مولانا کی فراق کی تمام غزلیں اسی دور کی لکھی ہوئی ہیں اب تو کچھ اور حقائق بھی سامنے آئے ہیں کہ جس کنوئیں میں شمس تبریز کو قتل کر کے پھینکا گیا اس میں سے کچھ ثبوت ملے ہیں یہ تو ہے مولانا کا عقل سے عشق کی طرف رجوع کرنا۔

مولانا کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے مولوی سلسلہ درویشاں شروع کیا۔ اس سلسلے میں سماع پر بہت اصرار ہے مولانا کو خود سماع کا بہت شوق تھا اس سلسلے میں درویش جو رقص کرتے ہیں اس کے ساتھ روحانی قسم کی موسیقی ہوتی ہے جس پر یہ رقص کرتے ہیں اس میں سب سے اہم ساز دو ہیں ایک رباب اور دوسری نے۔ نے ایک طرح کی بانسری ہے لیکن یہ ہماری طرح کی بانسری نہیں۔ یہ ایک موٹی سی بانسری ہوتی ہے اور اس کی آواز بہت ہی بھاری اور مغموم ہوتی ہے اسے سن کر انسان کا دل امڈ آتا ہے مولانا نے خود کہا ہے کہ یہ "نے" کی آواز اصل میں لکڑی کے ٹکڑے کی ایک طرح کی آہ و فریاد ہے کہ وہ درخت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ میں دوبارہ درخت کا حصہ بن جاؤں۔ اسی طرح رباب کی آواز میں بھی بہت زیادہ سوز ہے یہ دونوں ساز مولانا کے محبوب ساز تھے۔ درویشوں کے رقص میں خصوصی چیز یہ ہے کہ خاص انداز سے کیا جاتا ہے مثلاً سب سے آگے ان کا شیخ ہوتا ہے جو گروپ کا امام ہوتا ہے اسے شیخ کہا جاتا ہے اس کے بعد مرید آتے ہیں جنہوں نے لمبے چوغے پہن رکھے ہوتے ہیں یہ سفید رنگ کا ہوتا ہے اور سر پر لمبی طربوش پہنی ہوتی ہے جس کو کسی زمانے میں رومی ٹوپی کہتے تھے یہ ایک قطار میں داخل ہوتے ہیں یہ حلقے بناتے ہیں۔ شیخ ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے ہر مرید شیخ کے سامنے آ کر جھکتا ہے وہ ایک طرح سے اس کی اشیر باد لیتا ہے اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اس طرح مزید جب حلقے بن جاتے ہیں تو پھر رقص شروع ہوتا ہے درویشوں کو ایسی

تربیت ہوتی ہے کہ یہ لٹو کی طرح گھومتے ہیں لیکن انہیں چکر نہیں آتے یہ گھومتے چلے جاتے ہیں یہ عمل نصف گھنٹہ یا گھنٹہ بھر جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات ساری ساری رات اس طرح گزر جاتی ہے دوسری اس رقص میں خاص بات یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اوپر رکھا جاتا ہے اور ہتھیلی آسمان کی طرف ہوتی ہے اور بایاں ہاتھ نیچے ہوتا ہے اور ہتھیلی زمین کی طرف رکھی جاتی ہے۔

رقص کے پس منظر میں تصور یہ ہے کہ آسمان کا تعلق زمین کے ساتھ وابستہ ہے جو پھرنے کا عمل ہے یہ ستاروں کا ایک محور کے اردگرد گھومنا ہے یہ ایک طرح سے ذکر الٰہی کا کائناتی طریقہ ہے یہ رقص کی نوعیت اجتماعی ہے انفرادی نہیں یہ ہے کہ مولوی طریقے کا انداز ذکر جو اپنے زمانے میں بہت معروف ہوا۔ کانگریس کے موقع پر ان رقصوں کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا جن میں ہم شریک ہوتے رہے بہت دلچسپ وقت گذرا مجھے جب بھی وقت ملتا۔ مولانا کے مزار پر حاضری دیتا۔ اسی احاطے میں انہوں نے علامہ اقبال کی فرضی قبر بنا رکھی ہے میرے مقالے میں جس پر ترک خصوصی طور پر بہت متاثر ہوئے وہ اسی قسم کے فقرے تھے جب میں نے علامہ اقبال اور مولانا رومی کا موازنہ کیا تو آخری پیراگراف یہ تھا کہ علامہ اقبال کے مزار سے مٹی لا کر مولانا روم کے مزار کے احاطے میں دفن کر دی گئی ہے اور ایک سمبالک قبر بنائی گئی ہے۔ کیونکہ علامہ کو اپنی زندگی میں اپنے مرشد کا دیدار نصیب نہیں ہوا تھا لہٰذا انہوں نے مٹی لا کر ان کے مرید کی قبر یہاں بنا دی ہے ساتھ ہی میں نے یہ کہا تھا کہ آپ اس بات کا خیال رکھئے۔ کہ اقبال پاکستان کا روحانی باپ ہیں اقبال بجائے خود رومی سے متاثر تھے تو اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پاکستان تو جنوب ایشیا میں واقع ہے لیکن اس کی جڑیں قونیہ میں ہیں ان جملوں سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور بار بار مجھ سے یہ جملے سنے وہاں کے اخباروں نے بھی ان جملوں کو نمایاں طور پر شائع کیا۔

اس کے بعد ایک اور کانفرنس انہی ایام میں ہو رہی تھی اس کا اہتمام اناطونیہ کے ایسکی شہر میں کیا گیا تھا ایسکی کا مطلب ترکی میں پرانا شہر ہے یہ شہر بھی اناطونیہ میں واقع ہے۔ قونیہ سے شمال مغرب کی طرف تین گھنٹے کا فاصلہ ہے اس شہر پر پچھلی جنگ عظیم میں یونانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور اسی مقام پر کمال اتاترک نے انہیں شکست فاش دی تھی یہ شہر اپنی جگہ پر معروف ہے لیکن اس کی مشہوری ترکوں کے

قونیہ (ترکی) میں مولانا رومی کے مزار کے احاطے میں علامہ اقبال کی فرضی قبر پر جاوید اقبال اور ان کی اہلیہ بیگم ناصرہ کھڑے ہیں۔

ایک ولی شاعر یونس امرے کی وجہ سے بھی ہے یہ مولانا روم کے ہم عصر تھے ان کا کلام بھی عشق و محبت کا کلام ہے وہ انسانیت میں آپس میں محبت کی تلقین کرتے ہیں ترکوں نے اقوام متحدہ کو درخواست کی ہے کہ آئندہ سال یعنی 91ء یونس امرے سال یعنی عشق و محبت کا سال قرار دیا جائے تاکہ دنیا میں محبت کو فروغ حاصل ہو یہ ترکی کا شاعر تھا اس کا کلام فارسی میں نہیں اس کا مشہور قطعہ ہے اس کا ترجمہ اس طرح ہے۔

آؤ ہم اکٹھے مل بیٹھیں
ایک دوسرے کے لیے آسانی پیدا کریں۔
محبت کریں اور کروائیں
تاکہ دنیا میں محبت کے سوا کچھ نہ رہے۔

تقریب کے آغاز سے پہلے تمام لوگ یونس امرے کے مزار پر پہنچے اتوار کا دن تھا ایک طرح سے ان کا عرس تھا بے شمار لوگ تھے وہاں پہنچ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جنرل ایوارن کی کی جو خواہش تھی کہ کمال ازم یا سیکولر ازم کی طرف آیا جائے وہ کامیاب نہیں کیونکہ میں نے یہاں سب خواتین کو ترکی لباس میں دیکھا جس کو ختم کرنے کی کوشش کمال اتاترک کے زمانے سے کی جا رہی ہے۔ مردوں سے زیادہ وہاں عورتیں نماز ادا کر رہی تھیں۔ کانفرنس کا پہلا سیشن ان کے مزار کے قریب ہی ہوا اگلے روز صبح نو بجے ایسکی شہر کے تمام سکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات اپنے قومی لباس میں جمع ہوئے غیر ملکی مندوبین اور ایسکی شہر کے گورنر بہاؤالدین کے ساتھ ان طلبہ و طالبات اور لوگوں نے لو مارچ کیا جس کو آپ قافلہ محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے محبت کے قافلوں کی مارچ کی پاکستان میں بھی ضرورت ہے اس قسم کے لو مارچ کراچی، حیدرآباد، لاہور، پشاور، کوئٹہ اور دیگر شہروں میں بھی کی جائیں تاکہ لوگوں میں محبت اور سلامتی بڑھے یہ لو مارچ شہر کے ایک کونے سے شروع ہوئی جب یہ شہر کے مرکز میں پہنچی تو لوگوں نے پھول نچھاور کئے سب سے اگلی قطار میں گورنر اور غیر ملکی مندوبین اور سفیر تھے ہم نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں تھام رکھا تھا جس طرح سوشلسٹ ملکوں میں مارچیں ہوتی ہیں اسی قسم کی مارچ تھی اس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے میں نے وہاں جو مقالہ پڑھا اس میں یونس امرے کے پیغام کا حوالہ دیا اس کا موازنہ میں نے حضرت رابعہ بصری کے ایک قول سے کیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل لے کر بازاروں میں پھرا کرتی تھیں۔ کسی شخص نے پوچھا کہ پانی کا پیالہ اور جلتی ہوئی مشعل لے کر آپ کیوں پھرتی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پانی کے پیالے سے میں دوزخ کی آگ بجھا دینا چاہتی ہوں اور مشعل سے بہشت کو آگ لگا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محض محبت کی خاطر اس کی اطاعت کریں نہ کہ اس لالچ سے کہ مجھے اس کا بہشت کی صورت میں، میں اجر ملے گا یا دوزخ میں سزا ملے گی۔ تو میں دوزخ اور بہشت کو اس لیے ختم کرنا چاہتی ہوں تاکہ اللہ سے محبت کو فروغ حاصل ہو تو انسان کی انسان کے ساتھ بھی محبت بڑھے گی۔ مجھے پاک ترک کلچرل ایسوسی ایشن کے سربراہ ڈاکٹر محمد اوندر نے مدعو کیا تھا یہ ایک دو بار پاکستان بھی آ

چکے ہیں ان کی وہاں کافی خدمات ہیں مجھے انہوں نے اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ ترک پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن کو ختم کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کی کچھ شکایات ہیں مجھے افسوس ہوا کہ اگر یہ ایسوسی ایشن جو گذشتہ اٹھارہ برس سے قائم ہے اگر ختم ہو گئی تو بہت برا ہو گا ان کی جو شکایات ہیں وہ یہ ہیں کہ آج تک پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ہمیں ایک دمڑی بھی نہیں ملی اس لیے ہم جو بھی اہتمام کرتے ہیں یا شائع کرتے ہیں خود ہی کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے حال ہی میں جاوید نامہ کا ترکی ترجمہ شائع کیا ہے اس سے پیشتر بھی پاکستان کے متعلق کئی کتب شائع کی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اوندا نے اپنے طور پر ترکی وزارت ثقافت یا مخیر حضرات سے عطیات لے کر اس ایسوسی ایشن کو چلایا ہے ان کی شکایت یہ ہے کہ پاکستان سے ہم نے کبھی مالی امداد نہیں لی لیکن پاکستانی سفارت خانے کی عدم توجگی کی وجہ سے وہ اس ایسوسی ایشن کو بند کر دینا چاہتے ہیں میں نے پوچھا کہ اس کی وجوہات کیا ہیں۔ ڈاکٹر اوندا کو یہ خیال ہے کہ شائد حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اس وجہ سے پاکستانی سفارت خانہ میں ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا مثلاً پچھلی بار وزیراعظم سے پاکستانی سفارت خانے نے ڈاکٹر محمد اوندا سے ملانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا ایک شکایت تو یہ ہے کہ اس کا سبب ہو سکتا ہے کہ وقت کی کمی ہو لیکن پاکستانی سفارت خانے کی ذمہ داری تھی کہ اس قسم کی ملاقات کا اہتمام کیا جاتا۔ تاکہ پاکستان کے متعلق غلط قسم کا تاثر قائم نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد اوندر کو کبھی سفارت خانے میں خاص طور پر جب سے نئے سفیر آئے ہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ان کے پیش رو جو سفیر تھے وہ کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے شاید موجودہ سفیر تعلقات کے سیاسی پہلو کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

تیسری بات جو نہایت اہم ہے اور یہ سن کر مجھے بھی تعجب ہوا کہ پاکستانی حکومت کی وزارت تعلیم نے مختلف بیرونی ممالک میں پاکستان کے خرچ پر جو چیئرز قائم کر رکھی ہیں اور جن کو اردو پاکستان سٹڈیز کا نام دیا گیا ہے میں سے اب لفظ اردو خارج کر دیا گیا اب اس کا عنوان صرف پاکستان سٹڈیز چیئرز رکھا گیا ہے بقول ڈاکٹر محمد اوندر اس صورت میں اردو پڑھانے کے لیے لیکچرار اب شاید انہیں ہندوستان سے لینے پڑیں مجھے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ اردو کا لفظ کیوں نکالا گیا ہے سفارت خانے کی

طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ صرف نام کی تبدیلی ہوئی ہے پہلے یہ نام تھا اردو اور پاکستان سٹڈیز۔ اب صرف پاکستان سٹڈیز رکھ دیا گیا ہے وہاں بعض پاکستانیوں کا خیال تھا کہ یہ صرف نام ہی کی تبدیلی نہیں بلکہ اس میں وہ لوگ جو اردو نہیں جانتے ان کو نوکریاں فراہم کرنے کے لیے اس کا نام تبدیل کیا گیا ہے کیونکہ پاکستان سٹڈیز کے متعلق تو کوئی بھی پنجابی، بلوچی، سندھی یا پختون لیکچرار کام کر سکتا ہے اور اپنا اپنا تمدن وہاں پیش کر سکتا ہے اور اگر اردو کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی کوئی قومی زبان نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر محمد اوندر نے مجھے یہ بھی پوچھا کہ اگر اردو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں تو پھر کیا آپ انگریزی کو اپنی قومی زبان بنائیں گے یا چار صوبائی زبانیں آپ سیکھیں گے میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے ایسوسی ایشن کو بند نہ کرنے کے لیے ڈاکٹر اوندر کی بڑی منت سماجت کی انہیں کہا کہ حکومت پاکستان کی یہ پالیسی نہیں ہو سکتی ممکن ہے سفارت خانے کی کوتاہی ہو اور سفیر متعلقہ کو اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سابق صدر جنرل ضیاءالحق گو فوجی آمر تھے لیکن ترکی میں انہیں تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک تو بات یہ ہے کہ وہ صدر ایوارن کے بھائی بنے ہوئے تھے دوسرا ترکی اور پاکستان دونوں برادر ملک ایسے تجربات میں سے گزرے ہیں جو سانجھے ہیں۔ مثلاً ہم دونوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ جمہوریت چلے لیکن نہیں چلتی تو مارشل لاء لگتا ہے ان کے ہاں بھی مارشل لاء لگے ہمارے ہاں بھی مارشل لاء لگتے رہے انہوں نے اپنے وزیراعظم کو پھانسی کی سزا دی ہم نے بھی اپنے وزیراعظم کو پھانسی کی سزا دی۔ وہ بھی بعد ازاں عسکری آمریت کے دور سے گزرے ہم بھی عسکری آمریت کے دور سے گزرے اب ان کے ہاں بھی جمہوریت کا تجربہ کیا جا رہا ہے اور ہمارے ہاں بھی جمہوریت کا تجربہ کیا جا رہا ہے اس اعتبار سے ترکی اور پاکستان کے تجربات ایک طرح سے یکساں ہیں ان میں مشابہت ہے جنرل ضیاءالحق کی وہاں مقبولیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بھی ترک اخبار نویسوں کو ملنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جس کسی نے بھی انٹرویو مانگا وہ بلا کر بڑی محبت سے انٹرویو دیتے تھے علاوہ اس کے ان کی ذاتی انکساری بھی تھی اس وجہ سے وہ مقبول عام تھے انکساری کے ساتھ ان کی سادگی اور اسلامی طور طریقہ بھی تھا اس اعتبار سے ہماری

حکومت میں جو تبدیلی آئی ہے وہ لوگ عام طور پر اس کا موازنہ کرتے ہیں مجھے بتایا گیا کہ ہماری وزیراعظم جب پچھلی مرتبہ ترکی گئیں۔ تو شاید وقت کم تھا بہت سارے اخبار نویسوں کو ملیں مگر بعض کو نہ مل سکیں انہوں نے اخبارات میں جو مضامین لکھے ان میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ یہ منتخب وزیراعظم ہیں ان تک ہماری رسائی نہ ہو سکی حالانکہ جنرل ضیاءالحق تک ہم باآسانی رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ ترکی کے وزیر اعظم عدنان میندرس اور اس کی کابینہ کے بعض وزراء کو ملٹری کورٹ میں ٹرائل کے بعد پھانسی پر چڑھایا گیا تھا اور اس زمانے کے صدر جلال بایار کو عمر قید دی گئی اس وقت ترکی میں جنرل گرسل کے تحت مارشل لاء کی حکومت تھی عدنان میندرس کو پھانسی دیئے جانے کے سلسلے میں جو اخراجات اٹھائے گئے مثلاً رسے اور دار کی قیمت جلاد اور ڈاکٹر کی فیس کفن اور تجہیز و تکفین کے اخراجات ان سب کا بل عدنان میندرس کے خاندان کے افراد کو بھیجا گیا تھا جو انہیں ادا کرنا پڑا۔ لیکن اب ترک پارلیمنٹ جو ملٹری عدالت کا فیصلہ تو نہ بدل سکتی تھی لیکن متفقہ طور پر تمام ممبران اسمبلی نے اس فعل پر ندامت کی قرارداد منظور کی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ منتخب اراکین اس زمانے کی منتخب حکومت کے وزیراعظم کو دی گئی پھانسی کی سزا پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔

ترکی میں آج کل جو سب سے اہم بحث چل رہی ہے وہ سیکولرازم اور اسلام کی بحث ہے مجھ سے جن اخبار نویسوں نے بھی انٹرویو لیے انہوں نے مجھے اس مسئلے پر اظہار خیال کرنے کو کہا بات اصل میں یہ ہے کہ ترکوں کی نفسیات میں ایک بہت بڑا بحران ہے وہ ترک قومیت اور سیکولرازم کا تصور جو کمال اتاترک نے دے رکھا ہے کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اسی طرح اسلام سے چھٹکارا حاصل کر سکنا بھی ان کے لیے مشکل ہے لہٰذا اکثر تعلیم یافتہ ترک دین و دنیا کی اسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ جہاں تک عام ترک مرد و خواتین کا تعلق ہے اور جنہیں اناطولیہ کے شہروں اور دیہات میں دیکھا جا سکتا ہے ان کی اسلام سے گہری وابستگی ہے اور ان خطوں میں جنرل ایورن کی کوششوں کے باوجود نہ تو اپنا قومی لباس چھوڑا ہے اور نہ ہی سر ڈھانپنے کے لیے چادر کو ترک کیا گیا ہے ترکی میں سیکولرازم کے حامی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام مذاہب کی تکریم اور

آزادی کے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ صورت نہیں کیونکہ عملی طور پر وہ ریاست کو مذہب سے قطعی طور پر لاتعلق رکھنا چاہتے ہیں۔ دیگر گروہ جو اسلام کے حامی ہیں ان کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ ہیں اس وقت ترکی میں تقریباً چار یا پانچ ایسی سیاسی جماعتیں ہیں جو جمہوریت کی دوڑ میں ایک دوسری سے سبقت لے جانا چاہتی ہیں اس وقت حکومت ترگت اوزال کی پارٹی کی ہے جو سیکولرازم کا دم بھرتے ہوئے بھی انفرادی اور ذاتی طور پر اسلام سے لاتعلق نہیں۔ دوسری اہم جماعت جس کا آئندہ الیکشن میں کامیاب ہو کر حکومت بنانے کا امکان ہے وہ سلیمان ڈیمیرل کی پارٹی ہے اس کا نام سٹریٹ پاتھ پارٹی یا راہ مستقیم پارٹی ہے۔ اس کا پرانا نام جسٹس پارٹی تھا اور عدنان میندرس کا تعلق اسی پارٹی سے تھا۔ یہ پارٹی بھی اسلام سے اپنی وابستگی رکھتی ہے لیکن انداز فکر لبرل ہے پھر عصمت انونو کے بیٹے کی پارٹی ہے جس کا سوشلسٹ پروگرام ہے اسی طرح بلند ایجوت کی پارٹی بھی سوشلسٹ ہے یہ دونوں جماعتیں سیکولر نوعیت کی ہیں اور اسلام سے اپنے آپ کو لاتعلق کہتی ہیں سیکولرازم اور کمال ازم کے بحث میں یہی پارٹیاں پیش پیش ہیں ان کے علاوہ ملی پارٹی بھی ہے جو خالصتاً اسلامی نقطہ نگاہ رکھتی ہے اور جو ہماری جماعت اسلامی یا جمعیت علماء پاکستان یا جمعیت علماء اسلام کی طرح ہے گو اس کا اثر و رسوخ کچھ بڑھا ہے لیکن بنیاد پرستوں کی حکومت بن سکنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

بھٹو کا مقدمہ

مجھے کئی عظیم شخصیتوں سے قرب کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں ایک جسٹس کیانی ہیں۔ ان کی دلیرانہ حق گوئی سے اس ملک کا ہر باضمیر شخص متاثر ہوا۔ انہوں نے نہایت نازک دور میں نہ صرف عدلیہ کی ضمیر برداری، وقار اور آزادی کے تحفظ کا بیڑہ اٹھایا بلکہ اپنے عمل سے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کسی اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔

ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جب جسٹس نسیم شاہ اور میرے درمیان ہائی کورٹ بار کے صدر کے لئے مقابلہ ہوا تو میں جیت گیا اور وہ ہار گئے۔ جیتنے کے بعد میں ان کے گھر گیا اور ان کے والد سید محسن شاہ سے مل کر کہا کہ "یہ جیتیں یا میں، ہم دونوں آپ کے بیٹے ہیں"۔ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مخالف امیدوار کی عزت کرنے ہی سے جمہوریت چل سکتی ہے۔ الیکشن کو سرمایہ دارانہ طور پر نہ لڑیں بلکہ اسے "سوشلائز" کریں۔

میں نے جو کہا تھا کہ بھٹو کے قتل کیس کی سماعت سے عدلیہ کے وقار کو نقصان پہنچا ہے تو اس سے میری مراد یہ تھی کہ اس وقت مارشل لاء نافذ تھا تب اگر کوئی ایسا مقدمہ جو سیاسی نوعیت کا ہو اگر سول عدالت کے سامنے آتا ہے تو عام تاثر غلط ہو گا اس بنا پر کہ یہ عدلیہ آزاد نہیں ہے۔ اگر ملک میں آئین نافذ ہے اور سابق وزیراعظم پر بھی قتل کا مقدمہ بنتا ہے تو وہ عدلیہ ہی سن سکتا ہے اور کون سنے گا۔ مقصد یہ ہے کہ اس مقدمے میں جو خرابی تھی کہ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ بھٹو کا مقدمہ سیاسی نوعیت کا تھا وہ سول عدالت کو دیا گیا۔ سپریم لاء مارشل لاء تھا۔ اگر وہ فیصلہ صحیح بھی ہو تو عام تاثر یہ تھا کہ عدلیہ آزاد نہیں ہو سکتا کیونکہ ملک میں مارشل لاء لگا ہوا ہے۔ کالا باغ کا کیس کس نے سنا تھا۔ وہ عدلیہ نے ہی سنا تھا۔ لہٰذا میرا یہ کہنا کہ عدلیہ کا وقار مجروح ہوا اس کا تعلق فیصلے کی نوعیت پر نہیں فیصلہ صحیح ہوا یا غلط یہ علیحدہ بات ہے۔ جب عدلیہ کوئی فیصلہ کر دیتی ہے تو پھر عدلیہ کا اس کے ساتھ کوئی

تعلق نہیں رہتا۔ وہ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ جو پبلک پراپرٹی بن جائے اس پر ہر کوئی رائے زنی کر سکتا ہے۔ آپ اس پر چاہے سیمینار کریں یا جو چاہیں کریں۔ مارشل لاء ریگولیشن ایک اس نوعیت کی بھی تھی کہ جو بھی عوامی اہمیت کے فوجداری جرائم کا کیس ہو وہ سول عدالت کے سامنے نہ جائے بلکہ وہ ملٹری عدالت کے سامنے جائے۔ بھٹو کا کیس عوامی اہمیت کا کیس تھا تو پھر اس کو مارشل لاء کورٹ سنتی۔ سول عدالت نہ سنتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیصلے کی نوعیت پر بحث کرنا فضول ہے۔ بعض فیصلے صحیح اور بعض غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ اب آپ بحث کر کے اس میں کیا نکالیں گے۔ اس سے آپ عدلیہ کے وقار کو مجروح کریں گے اور اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔ تنازعہ ہی بنے گا۔ حل کوئی نہیں۔ دو فریق ہیں۔ ایک نے کہنا ہے کہ فیصلہ درست ہوا ہے، دوسرے نے کہنا ہے غلط ہوا ہے۔ یہ بحث جتنی بھی طویل ہو گی اس سے عدلیہ کو نقصان پہنچے گا۔ عدلیہ خود مختار باڈی ہونی چاہیے۔ اس کے اپنے فنڈز ہونے چاہئیں۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا مودودی نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی جسٹس جاوید اقبال نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ علامہ اقبال کے زمانے میں یہاں ایک زمیندار تھے جن کی کوشش تھی کہ یہاں ایک اسلامی تعلیمی ادارہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مولانا مودودی کو لاہور بلوایا۔ علامہ اقبال سے مودودی صاحب کی ملاقاتیں بھی اسی زمانے میں ہوئیں، یہ علامہ کے آخری ایام تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ علامہ کی کوشش تھی کہ ایسے علماء جن کی دلچسپی قانون شریعت کی وضاحت سے ہے، ان کو ہندوستان سے پنجاب میں مقیم کیا جائے۔ اسی طرح علامہ کی کوشش تھی کہ سید سلیمان ندوی کو بھی یہاں لایا جائے۔ علامہ کے خیال میں وہ وقت قریب تھا جب یہاں مسلم ریاست کا قیام ہونا تھا۔ اگر علامہ کا اس مسئلے پر مولانا مودودی سے اتفاق تھا تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ مولانا مودودی کس طرح پاکستان کے مخالف ہو سکتے ہیں کیونکہ علامہ نے مولانا مودودی سے ذکر تو کیا ہو گا کہ وہ ان کو پنجاب کیوں لانا چاہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اس کا پس منظر ہو گا۔ جہاں تک مولانا مودودی کے نظریات کا تعلق ہے تو میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہر شخص کے اپنے اپنے نظریات ہوئے ہیں۔ بہت سے علماء نے علامہ اقبال کے نظریات سے اتفاق نہیں کیا۔ مولانا ابوالحسن ندوی علامہ کے بہت سے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ہم میں رواداری نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ یا تو

آپ مجھ سے اتفاق کریں یا پھر آپ میرے مخالف ہیں یعنی اختلاف کا حق نہیں۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ فلاں کے نظریات درست ہیں اور فلاں کے درست نہیں۔ نظریات کی کسوٹی وقت ہے۔ وقت بتاتا ہے کہ کس نظریے میں کتنی طاقت ہے اگر کوئی نظریہ وقت کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو پھر اس نظریے کی قدرومنزلت ہے اس لیے مناظروں اور مباحثوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال چند اختلافی امور

ابتدا میں علامہ اقبال کا مولانا رومی اور منصور حلاج کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ یہ وجودی صوفیاء ہیں لیکن جب انہوں نے مزید مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ وجودی نہیں تھے۔ بلکہ ایک طرح کی ایسی انسانی خودی کی تصدیق کرتے ہیں جو اقبال کا اپنا نظریہ تھا۔ اس لیے پھر وہ علامہ کے راہبر بن گئے۔ مولانا رومی کو انہوں نے پیر رومی کہا۔ انسان کی زندگی میں تغیروتبدل آتے رہتے ہیں ان کے نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ خدا کے وجود کے متعلق عقلی طور پر کیا کیا دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ عقلی طور پر فلسفے نے بعض دلیلیں وضع کی ہوئی ہیں ان میں تین سب سے مشہور ارسطو کی ہیں۔ علامہ اقبال یہ بتاتے ہیں کہ عقلی طور پر خدا کے وجود کو ثابت کرنا ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں جو دلیل خدا کے وجود کے استحکام کا باعث ہوتی ہے وہی منطق اسے توڑ بھی سکتی ہے۔ لہٰذا عقل کے ذریعے خدا تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد آپ اس بحث پر آتے ہیں کہ عقل کے علاوہ علم یا معرفت حاصل کرنے کے لیے خدا نے انسان کو اور کیا قدرتیں عطا کی ہوئی ہیں۔ ایک تو عقل ہے اور دوسرا مشاہدہ ہے۔ تیسری قوت وجدان ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو جتنی بھی صلاحیتیں دی ہوئی ہیں یعنی عقل، وجدان یا مشاہدہ، ان میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ برکلے نے خدا کی ایک مشاہداتی دلیل بھی دی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجود کاانحصار مشاہدے پر ہے۔ اس کمرے میں آپ موجود ہیں۔ میز ہے کرسی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب اشیا میرے مشاہدے میں ہیں۔ آپ کے لیے میں موجود ہوں کیونکہ میں آپ کے مشاہدے میں ہوں جب ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو اس دلیل کے مطابق ہمارے وجود کو عدم میں چلا جانا چاہیئے یعنی ہماری ہستی ختم ہو جانی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ہم سب یعنی کائنات، حیات اور مخلوقات خدا کے مسلسل مشاہدے میں ہیں اس لیے جب ہم ایک دوسرے کے مشاہدے میں نہیں ہوتے تب بھی ہمارا وجود برقرار رہتا ہے۔ علامہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہماری عقل محدود ہے، اور صرف روزمرہ کے معاملات

1975ء میں تہران یونیورسٹی کے فردوس ہال میں جاوید اقبال یوم اقبال کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں۔

کو سلجھانے کے لیے عطا کی گئی ہے۔ اس کی خدا تک رسائی نہیں۔ اس لیے وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی اہل نہیں۔ مطلب یہ کہ ہماری عقل محض عملی نوعیت کی ہے، عقل خالص نہیں۔ اسی طرح وہ فرماتے ہیں کہ تجربہ اور مشاہدہ جس کا انحصار حواس خمسہ پر ہو وہ بھی قابل اعتماد نہیں۔ پانی کے نیچے اگر چھڑی پڑی ہو تو ٹیڑھی میڑھی نظر آئے گی، باہر نکالیں تو سیدھی ہو گی۔ یہ ہماری بصارت کا دھوکا ہے۔ تیسری قوت جو انسان کو عطا کی گئی ہے وہ وجدان یا بصیرت ہے اس میں بھی غلطی کا امکان ہے کیونکہ بقول اقبال بسا اوقات کوئی نہ کوئی طاغوتی قوت ہمارے وجدانی سرکٹ میں دخل انداز ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو خواب آتا ہے کہ اپنے بچے کی قربانی دے دو اور وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ ہماری عدالتوں میں بعض اوقات ایسے قتل کے مقدمے آتے ہیں جس میں باپ نے اپنے بیٹے کو ایسے ہی حکم کی تعمیل میں ذبح کر دیا ہو۔ اب ایسا حکم شیطانی ہی ہو سکتا ہے، رحمانی نہیں ہو سکتا۔ سو انفرادی طور پر عقل مشاہدہ اور وجدان وجود باری ثابت کرنے کے لیے قابل اعتماد ذرائع نہیں ہیں۔ لیکن علامہ فرماتے ہیں کہ اگر ان تینوں ذریعوں کو بیک وقت استعمال میں لایا جائے اور ایک کو دوسرے کی کسوٹی کے طور پر استعمال کیا جائے تو خدا کے وجود کی تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن ان کی یہ دلیل تسلی بخش معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اگر ہمارا ہر ذریعہ معلومات ناقص ہے تو ان کو بیک وقت اکٹھے استعمال میں لا کر انہیں کیسے قابل اعتماد بنایا جا سکتا ہے۔ بہرحال علامہ اقبال کی خدا کے وجود کے متعلق محبوب ترین دلیل دراصل جذباتی دلیل ہے جس کا اظہار مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایف سی کالج کے ایک پرنسپل پروفیسر لُکس نے ان سے پوچھا کہ آپ فلسفی ہیں، خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے متعلق آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ علامہ نے جواب دیا کہ میرے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرما دیا کہ خدا ہے۔ مطلب یہ کہ رسول پاکؐ کی دیانت اور امانت کو آپ کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ اقبال کے نزدیک رسولؐ اللہ انسان کامل تھے۔ اس لیے اگر آنحضورؐ نے خدا کے وجود کے متعلق فرما دیا تو ان کا فرمان درست سمجھا جانا چاہیے۔ علامہ اقبال کی اس جذباتی دلیل میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو اس میں عشق رسولؐ کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرا یہ کہ خدا تک رسائی کا امکان کسی انسان کامل کی مریدی یا توسط ہی سے ہو سکتا

ہے۔

علامہ کے نزدیک اگر انسان خودیٔ محدود ہے تو خدا خودیٔ مطلق ہے۔ اب یہاں بعض مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ خودی کا تصور جسم کے بغیر ممکن نہیں اور اگر خودی سے مراد شخصیت ہے تو تب اس کے تصور کا انحصار تشخص یا کسی نہ کسی قسم کی محدودیت پر کرنا پڑے گا۔ یوں خودیٔ محدود کا تصور تو ممکن ہے لیکن ان بنیادوں پو خودیٔ مطلق کو کسی نہ کسی انداز میں محدود سمجھنا پڑے گا۔ علامہ اس مسئلے کو قرآن شریف کی اس آیت کے حوالے سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی وضاحت کے سلسلے میں بعض محدود اصطلاحیں استعمال کر رکھی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک نور ہوں جس طرح گویا دیوار کی روزن میں ایک چراغ ہو جس پر ایک قندیل ہو اور وہ چراغ ستارے کی طرح چمک رہا ہو۔ پس اس آیت کو پیش کرکے علامہ کہتے ہیں کہ خدا کی لامحدودیت اس کی وسعت میں نہیں بلکہ شدت عمل تخلیق کی گہرائیوں میں ہے۔ اب اس دلیل میں جو بات ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وسعت کے اعتبار سے خدا کے تشخص کو متعین کر دیا گیا۔ مطلب یہ کہ خودیٔ مطلق یا خدا کی شخصیت وسعت کے اعتبار سے تو محدود ہے لیکن عمل تخلیق کے امکانات کے اعتبار سے لامحدود ہے

اب متعین شخصیت کا جسم کے بغیر تصور ممکن نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے بعض فرقے خداوند تعالیٰ کی تجسیم کے قائل تھے۔ علامہ خدا کی تجسیم کے قائل نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ خودیٔ مطلق کا تصور جسم کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ان کا استدلال بعض مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال حیات بعد موت کے قائل ہیں اور ان کے کہنے کے مطابق خودیٔ محدود اگر اپنے آپ کو مستحکم کر لے تو اسے موت کے بعد بھی حیات مل سکتی ہے۔

اگر ایسا انفرادی طور پر ہر روح کے لیے ممکن ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اس کی شناخت کس طرح ہو گی۔ اس مسئلے کے حل کے ضمن میں اقبال شاہ ولی اللہ کا حوالہ پیش کرتے ہیں کہ ہر روح کو بھی ایک لطیف جسم جسے وہ نسمہ کہتے ہیں، عطا کیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں اقبال سنسکرت کی اصطلاح "سریر" بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ یعنی سریر یا نسمہ وہ لطیف جسم ہے جو ہر اس روح کو عطا کیا جائے گا جس کو حیات بعد موت

نصیب ہو گی۔ یہاں بھی فکری مشکلات موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ انفرادی خودی کے تصور کے لیے تو نسمہ یا سریر کا سہارا لیا گیا ہے تو خودیٔ مطلق کی شناخت کسی قسم کے جسم نسمہ یا سریر کے بغیر کیسے ممکن ہے۔

اسی بحث کا ایک اور پہلو بھی اقبال شناسوں کے لیے مشکلات کا باعث بنتا ہے اور وہ اقبال کا اجتماعی خودی کا تصور ہے۔ اجتماعی خودی سے ان کی مراد معاشرہ یا سوسائٹی ہے۔ اقبال ایک طرف تو انفرادی خودی کے استحکام پر زور دیتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی خودی کے لیے انفرادی خودی اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اور یوں خودی بے خودی میں تبدیل ہو جائے۔ بقول ان کے فرد اپنی خودی کا استحکام کرے۔ اور پھر وہی فرد معاشرے یا سوسائٹی میں اپنے آپ کو مستغرق کر دے۔ یہاں جو فکری تضاد موجود ہے اس کو بعض اقبال شناسوں نے اپنی طرف سے حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ اس مسئلے کی موجودگی کا ایک پس منظر بھی ہے اور وہ یہ کہ جب اسرار خودی شائع ہوئی تو علامہ کے ایک دوست اور اردو زبان کے معروف نقاد جناب بجنوری نے انہیں تحریر کیا کہ آپ نے اسرار خودی تحریر کرکے فرد کو خدا کے مقام پر پہنچا دیا لیکن معاشرہ یا سوسائٹی کدھر گئی۔ جناب بجنوری کے اسی اعتراض پر اسرار خودی کے بعد رموز بے خودی تحریر کی گئی لیکن تضاد کی فکری مشکل جوں کی توں رہی۔ صوفیاء کرام کے نزدیک تو بے خودی کا عالم خدا میں استغراق کی صورت میں ہونا چاہیئے۔ لیکن اقبال، خدا اور انسان میں تو فاصلہ برقرار رکھتے ہیں بلکہ ان کا ایک قول ہے کہ اگر مجھے معلوم ہو کہ خدا مجھے ملنے آ رہا ہے تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں لیکن فرد سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اپنا سب کچھ قربان کرکے معاشرہ یا سوسائٹی میں مستغرق ہو جائے۔ سو اقبال کے ہاں خودی اور بے خودی کو سمجھنے کے لیے مشکلات موجود ہیں جس طرح خودیٔ مطلق کے تصور کو سمجھنے میں مشکل حائل ہے۔

اس بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا یہاں ذکر کر دینا چاہیئے۔ علامہ کی اپنی زندگی میں ایسے مراحل آئے جب ان پر بے خودی یا سکر کا عالم طاری ہوا حالانکہ وہ ذاتی طور پر صحو یا بیداری کے قائل تھے۔ نظم خضر راہ کی شان نزول کے بارے میں علامہ نے خود کہا ہے کہ میرا حضرت خضر سے ملاقات کا تجربہ ہوا۔ اس زمانے میں آپ

بیمار تھے کیونکہ نقرس کی درد کا حملہ ہوا تھا۔ یہ واقعہ انار کلی کے مکان میں پیش آیا۔ ان کے ملازم علی بخش کے بیان کے مطابق اس نے علامہ کو خواب گاہ میں کسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ کچھ مدت بعد علامہ نے علی بخش کو آواز دے کر اندر بلایا کہ میرے پاس ابھی ایک بزرگ بیٹھے تھے جو ابھی اٹھ کر گئے ہیں تم فوراً ان کے پیچھے جاؤ اور انہیں بلا لاؤ کیونکہ میں نے ان سے دو تین مزید سوال پوچھنے ہیں۔ علی بخش سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی، اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو باہر کوئی نہیں تھا۔ رات کے دو تین بجے تھے سردیوں کا موسم تھا، باہر دھند تھی۔ بازار سنسان تھا۔ علی بخش نے اوپر آکر بتلایا کہ باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اس پر علامہ "اچھا ٹھیک ہے" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں، میں نے بھی انہیں کم از کم دو موقعوں پر مولانا رومی اور غالب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ملاقاتیں بھی بے خودی یا سکر کے عالم میں ہوئی تھیں۔ علامہ ان دنوں شدید بیمار تھے۔ انہیں دل کی تکلیف کے ساتھ دمے کا عارضہ تھا۔ بعض اوقات جب درد کا دورہ پڑتا تو کھانستے ہوئے نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ یہ گفتگوئیں ایسی ہی کیفیات میں کی گئی تھیں۔ دونوں موقعوں پر علی بخش کو بلا کر ان بزرگوں کے پیچھے جانے کے لیے کہا گیا۔ علامہ کی وفات کے بعد میں نے ان کے رفیق اور دوست چودھری محمد حسین سے کہا کہ ان کیفیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے منع کر دیا کہ یہ بے خودی یا عالم سکر کی کیفیات نہیں بلکہ ان کی بیماری کی کیفیات ہیں جن کا ان کے فکری تصورات سہو اور بیداری سے تصادم ہوتا ہے۔ گویا چودھری صاحب کے نزدیک ایسے واقعات کی تشہیر سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے کہ سکر یا بے خودی کا عالم بھی ایک حقیقت ہے حالانکہ اقبال نے ایسی کیفیات کی نفی کر رکھی ہے۔ پس چودھری صاحب کے خیال میں یہ بے خودی یا سکر کی کیفیت نہیں جو ذکر میں مستی کے عالم میں طاری ہو جاتی ہے۔

علامہ کے بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ ابتداً علامہ وجودی تصوف کے قائل تھے جس میں بے خودی اور سہو کی کیفیات طاری ہو سکنے کا امکان ہے۔ بعد ازاں وہ وجودی تصوف کے مخالف ہو گئے۔ لیکن آخری ایام میں وہ پھر وجودیت کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اس خیال کے حامی جگن ناتھ آزاد اور مولانا صباح الدین عبدالرحمن ہیں۔

میری نظر میں امجد اسلام امجد کا بھی اسی موضوع پر ایک مقالہ گزرا ہے وہ بھی اسی رائے کے ہیں۔ علامہ ہمیشہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان ایک متغیر خودی ہے وہ پتھر نہیں اس لیے وہ اپنے نظریات بدل سکتا ہے بلکہ یہ اس کا استحقاق ہے۔ شاید اسی سبب ان کے بعض نقادوں نے ان کے افکار میں تضاد پایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اقبال کے تضادات کے عنوان کے تحت ایک مقالہ لکھ رکھا ہے۔ وہ انکے اشعار کی تشریح کے سلسلے میں بھی بعض مشکلات پاتے ہیں اور کلام اقبال تسہیل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ خیر میری نگاہ میں اگر فکری تسلسل کی ضرورت ہے تو فلسفے میں ہے مگر علامہ اپنے آپ کو ہمیشہ فلسفی کہنے سے گریز کرتے رہے۔ ان کے نزدیک ان کے فکری مسائل کو عشق رسولؐ کے ذریعے ہی انہوں نے حل کیا ہے۔

میرے خیال میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی فلسفۂ حیات ہوتا ہے بلکہ ہر انسان اپنی زندگی گزارنے کے لیے جو راستہ متعین کرتا ہے، وہی ایک اعتبار سے اس کا فلسفۂ حیات ہے۔ آج کے زمانے میں زندگی کی تگ و دو کے دوران خدا کے وجود کو تسلیم کرلینا کوئی آسان بات نہیں۔ بلکہ جو حقیقی معنوں میں ایسا کر سکنے کے قابل ہے، وہ قابل رشک ہے۔ یہاں مجھے حضرت علامہ کا شعر یاد آ رہا ہے ملا سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک تو اس زمانے میں اقرار باللسان (یعنی محض زبان سے خدا کی ہستی کا اقرار کر لینا) بھی بہت مشکل ہے۔ اور تم دعوےٰ کرتے ہو اقرار بالقلب (دل سے خدا کی ہستی کا اقرار کرنا) کا۔ تو یہ تم ہی کر سکتے ہو۔ ایسی منافقت مجھ سے نہیں ہو سکتی۔

میرے لیے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر، کہ ملّا ہیں صاحبِ تصدیق!
اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق!

خیر علامہ کے خیالات کی تشریح مختلف حلقے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ ایسی تشریح میں زیادہ تر ان کا اپنا موقف ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر میں سوشلسٹ ہوں تو میں اقبال کو سوشلسٹ کے طور پر پیش کروں گا۔ اگر بنیاد پرست ہوں تو اقبال کو ایک رجعت پسند شخصیت کے طور پر پیش کروں گا۔ غلام احمد پرویز صاحب کے نزدیک

قرآن ہی سب کچھ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت ثانوی ہے۔ جبکہ اقبال کا تمام فکر عشقِ رسولؐ پر مبنی ہے۔ اقبال کے ہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس قدر اہمیت ہے کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ روزِ محشر اگر تم نے میرا حساب ہی لینا ہے تو میرے آقا رسول اللہؐ کی نگاہوں سے چھپا کر میرا حساب لینا، میرے آقا کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

ظاہر ہے اگر اقبال کے فکر سے عشقِ رسولؐ کا پہلو خارج کر دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا اس لیے اگر غلام احمد پرویز صاحب اقبال کی تشریح کرتے ہیں اور اس پہلو کو نظر انداز کر کے تشریح کرتے ہیں، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک صحیح تشریح پیش کر رہے ہیں۔ خدا کی توحید پر یقین رکھتے ہوئے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوز و گداز کا ایک بڑا نازک مسئلہ ہے۔ بسا اوقات اس مرحلے پر عقل ناکام ہو جاتی ہے۔ بہر حال فکر کے میدان میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اقبال کا رہبر ہے۔ لیکن وہ جب فقہ اسلامی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی اپروچ مختلف ہو جاتی ہے۔ اور اجتہاد پر بحث کے دوران احادیث کو پوری طرح جانچ پرکھ کر ہی تسلیم کرنے کے حق میں ہیں۔ خیر ہر شخص خواہ وہ عالم ہو یا سیاستدان یا دانشور، اپنا موقف پہلے متعین کرتا ہے اور بعد میں اس موقف میں اقبال کو فٹ کرتا ہے۔ گویا موقف ایک مخصوص سائز کی قبر ہے اور اس میں لاش کو فٹ کرنا ہے چاہے اس کے ہاتھ پاؤں یا سر کاٹنا ہی کیوں نہ پڑیں۔

عہدِ ضیاء

اب آتا ہے ضیاءالحق صاحب کا دور۔ ان کے دور میں علامہ اقبال کا جشن صد سالہ ولادت منایا گیا۔ علامہ اقبال کانگرس ہوئی جس میں دنیا بھر سے اقبال شناس بلائے گئے۔ اس کا افتتاح ضیاءالحق صاحب نے کیا اور اس موقع پر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ جناب ضیاءالحق نے علامہ کی شخصیت کے حوالے سے ایسے کام کئے جو پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے مثلاً علامہ اقبال میوزیم بنا۔ علامہ اقبال کمپلیکس کے لیے زمین ملی۔ جس پر ایوان اقبال کی تعمیر جاری ہے۔ مجھے ضیاءالحق صاحب کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ اس طرح کا اسلامی معاشرہ وجود میں لائیں گے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس ڈگر سے ہٹ کے کسی اور طرف چلے گئے ہیں اور ایک ایسا نقطہ نگاہ اسلام کے متعلق پیش کر رہے ہیں جو ان کے اپنے اقتدار کو جائز قرار دینے کے لیے سوٹ کرتا ہے۔ حالانکہ شاید وہ اس انداز فکر کے نہیں تھے لیکن سیاسی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے مختلف کردار اختیار کیا۔ میں یہ بات ضیاءالحق صاحب کی زندگی میں کہتا رہا کہ جسے وہ اسلامائزیشن کہتے ہیں اصل میں یہ منافقت ہے صحیح اسلام کا انعقاد نہیں۔

25۔ دسمبر 1986ء میں ایوان صدر میں ضیاءالحق صاحب نے یوم قائداعظم منایا تھا اس میں انہوں نے ایک سوال ترتیب دیا تھا کہ قوم کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھے بھی فون کیا آپ بھی تشریف لائیں حالانکہ میں ان دنوں سپریم کورٹ کا جج تھا میں نے معذرت بھی کی کہنے لگے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ آپ کی ایک اور حیثیت بھی ہے۔ سو میں اس جلسے میں شریک ہوا۔ مجید نظامی صاحب میرے ساتھ تھے میں نے ضیاءالحق صاحب کو کہا کہ آپ مجھے تقریر کرنے کے لیے نہ کہئے گا لیکن انہوں نے اصرار کیا۔ مجھے انہوں نے اپنے سے ایک مقرر پہلے خطاب کی دعوت دی آخر میں انہوں نے خطاب کیا۔ میں نے کوئی تقریر لکھی تو نہیں تھی زبانی تقریر کی۔ میری تقریر سے وہاں بیٹھے ہوئے علماء بڑے سیخ پا ہوئے۔ اس تقریر میں،

میں نے ضیاءالحق صاحب کے بعض اقدامات پر تبصرہ کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محفل میں گرما گرمی آئی۔ ضیاءالحق صاحب نے اس موقع پر کہا کہ جاوید اقبال کی وجہ سے محفل میں گرما گرمی آئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ جو کچھ جاوید اقبال نے کہا ہے آپ اس کے متعلق فکر مند نہ ہوں ہم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اٹھائیں۔ اس طرح انہوں نے ایک طرح سے ان علماء کی دلجوئی کر دی۔

میری تقریر سے ضیاءالحق صاحب برافروختہ نہیں ہوئے بلکہ ایک موقع پر ضیاءالحق صاحب کنیرڈ کالج میں کانووکیشن میں خطاب کرنے آئے وہاں لڑکیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں کوئی پاگل ملا نہیں ہوں، میری بیٹی بھی ڈاکٹر ہے اور وہ بھی جاب کر رہی ہے اور خاندان میں آمدنی میں اضافے کا باعث ہے"۔ مجھے وہاں دیکھ کر باآواز بلند کہا کہ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں جاوید اقبال بیٹھے ہیں۔ واضح مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے کی خاطر اسلام کی اس طرح کی سیاسی پروجیکشن کرتے تھے۔ وہ ہمارے ملک کے پہلے ایسے سربراہ تھے جو پانچ وقت کے نمازی اور روزہ دار تھے۔ ان کی انفرادی زندگی ایک باعمل مسلمان کی تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انکسار سے ملتے۔ میں نے ضیاءالحق صاحب کو کئی بار کہا تھا کہ یہاں کی پولیس کس طرح حدود آرڈیننس کا غلط استعمال کر رہی ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی ترمیم کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا وہ بات سن لیتے تھے لیکن کرتے اپنی مرضی تھے۔

اس دور میں مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق بھی ہوا اس زمانے میں اندرا گاندھی اپوزیشن میں تھی وہاں ڈیسائی صاحب وزیراعظم تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی میں اور میری بیوی ڈیسائی صاحب کو ملنے گئی۔ باوجود 82 برس کی عمر میں وہ بڑے الرٹ اور سرخ رنگت کے مالک تھے۔ میری بیوی نے ان سے کہا کہ ماشاءاللہ آپ کی صحت بہت اچھی ہے باوجود اس کے کہ آپ کی اتنی عمر ہے تو مجھے ایک دم خیال آیا کہ وہ یہ نہ کہیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں اپنا پیشاب پیتا ہوں کیونکہ ان دنوں اخبارات میں ان کا اس قسم کا بیان چھپ چکا تھا۔

بہرحال انہوں نے جواب یہ دیا کہ میری صحت کا راز یہ ہے کہ میں کسی بات کو دل پر نہیں لگاتا اور ہر چیز کو خدا پر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں اندرا گاندھی سے بھی ملاقات

ہوئی میں نے انہیں لاہور آنے کی دعوت دی تاکہ وہ علامہ اقبال کی صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات میں شریک ہوں کیونکہ ان کے والد کے علامہ صاحب سے تعلقات رہے تھے تو اندرا گاندھی نے جواب دیا کہ پہلے مجھے میرا پاسپورٹ واپس دلائیں۔ اس وقت وزیر خارجہ واجپائی بھی وہاں موجود تھے تو وہ شاید ان کی موجودگی میں یہ بتانا چاہتی تھیں کہ انہوں نے میرا پاسپورٹ ضبط کیا ہوا ہے۔

ایک اور بات جو وزیراعظم ڈیسائی نے بتائی جب اندرا گاندھی کے بارے میں بات ہو رہی تھی وہ کہنے لگے کہ یہ جو انہوں نے مشرقی پاکستان میں مداخلت کی جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش بن گیا ہے۔ انہوں نے بجائے اس کے ہمارے لیے آسانی پیدا کی ہو مشکل پیدا کر دی ہے کہ ایک کے بجائے دو پاکستان بنوا دیئے ہیں اور اس سے ہمارے یہ خدشات بھی بڑھ گئے ہیں کہ اگر پاکستان ٹوٹ گیا ہے تو کل ہندوستان بھی ٹوٹ، سکتا ہے۔

اسی دوران کینیڈا، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کا دورہ کیا۔ اتفاق سے ان دنوں سردار عبدالقیوم خان صاحب بھی وہاں تھے۔ میری بعض تقاریر سے انہوں نے اختلاف کیا لیکن میری موجودگی میں نہیں۔ وہ تقاریر بعد میں یہاں پہنچیں اور اس پر ایک بحث چھڑ گئی۔ میرا نظریہ ہے کہ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان مناظروں اور مباہلوں سے پہنچا ہے۔ اس لیے میری کسی بات پر اگر کوئی شخص اعتراض کرے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اس کا جواب نہ دوں۔ میرا یقین ہے کہ مناظروں سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اصل میں خیالات و افکار کی بہترین کسوٹی وقت ہے۔ وقت بتاتا ہے کہ کس کے خیالات درست اور کس کے غلط ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں اس بحث میں جواب نہیں دیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب علامہ اقبال نے اسرار خودی لکھی جس میں انہوں نے حافظ پر حملہ کیا تو وہ صوفی جن کا وجودی تصوف سے تعلق تھا انہوں نے علامہ پر بہت اعتراض کئے انہیں اسلام کا دشمن اور روحانیت کا مخالف کہا اور پتہ نہیں کیا کچھ کہا۔ یہ مواد اخباروں اور رسالوں میں تین سال تک علامہ کے خلاف چھپتا رہا۔ ان کے سرخیل خواجہ حسن نظامی تھے۔ جن کے ساتھ علامہ کی دوستی بھی تھی لیکن آپ دیکھئے کہ اس لٹریچر کا نام و نشان نہیں ملتا جبکہ علامہ اقبال کے نظریات آج تک قائم ہیں۔

جنرل ضیاءالحق صاحب نے مجھے پنجاب ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیا اور مجلس شوریٰ میں خصوصی طور پر اس کا ذکر بھی کیا۔ اس زمانے میں ملک کے سارے چیف جسٹس قائم مقام تھے۔ دو برس بعد جب محمد خاں جونیجو وزیراعظم بنے اور آئین کے تحت جمہوریت قائم ہوئی تو جونیجو صاحب نے مجھے مستقل چیف جسٹس مقرر کیا۔ بعدازاں انہی کے عہد میں، میں سپریم کورٹ کا جج بھی بنا۔ جس منصب سے میں 4۔اکتوبر 1989ء کو ریٹائر ہوا۔

لیاقت علی خان سے بے نظیر بھٹو تک

س:۔ لیاقت علی خاں سے بے نظیر بھٹو تک جو پاکستان کے وزرائے اعظم رہے، ان کے بارے میں آپ کی رائے۔ قیام پاکستان کے جو مقاصد تھے۔ کیا آپ کے خیال میں ان میں سے کسی نے ان مقاصد پر عمل کیا۔

جاوید اقبال:۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اس کے مقاصد کا اظہار قرارداد مقاصد میں کیا جا چکا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تو ہمیں واضح کرنا چاہیئے کہ اسلام کی کونسی تعبیر پر بنا۔ جب پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو بعض لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر پاکستان بن گیا تو ہندوستان میں اسلام نہ رہے گا اور پاکستان میں مسلمان نہ رہیں گے۔ یعنی وہ پاکستان کے بنائے جانے ہی کے خلاف تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد آج بھی اسلام کی بعض ایسی تعبیریں پیش کی جارہی ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ گو پاکستان اسلام کے نام پر بن گیا لیکن جمہوریت اور اسلام اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ہمارے ذہن میں یہ واضح ہونا چاہیئے کہ بانیان پاکستان قائداعظم اور علامہ اقبال کے ذہن میں اسلام کی کیا تعبیر تھی جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا۔ مثلاً دو قومی نظریے کی اس شکل میں اسلامی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ برصغیر میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک مسلمان دوسری ہندو۔ مسلمان یہاں پر چھ سو سال حکمران رہے۔ اگر آپ البیرونی کی کتاب پڑھیں۔ البیرونی سن ایک ہزار عیسوی میں سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کتنا فرق ہے اور یہ کہ یہ کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ یعنی وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے۔ کہ ہندو مسلمان کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔ نہ اکٹھے بیٹھ کے کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں۔ اگر اکٹھے بیٹھ کر کھا یا پی لیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم پلید یا ناپاک ہو جائیں گے۔ جب وہ اکٹھے بیٹھ کر کھا پی نہ سکیں تو وہ ایک قوم کیونکر بن سکتی ہے۔ اس کی کتاب کے بعض اقتباسات بالکل اسی طرح کے ہیں جیسے قائداعظم کی تقاریر کے حصے ہوں۔ حالانکہ ان میں تقریباً نو سو برس کا فرق ہے۔ اس بات کی شہادت تو تاریخ میں مل سکتی ہے۔ لیکن انداز بیان کے اعتبار سے دو قومی نظریہ ایک نیا تخیل اور نیا تصور تھا۔ تین نئے

تصورات تھے جو جنوبی ایشیا میں مسلمان قائدین نے پیش کئے۔ ایک تو ہے دو قومی نظریہ۔ یہ ایک طرح کا منفی تصور ہے کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں ایک ہندو، دوسری مسلمان اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ دوسرا تصور مسلم قومیت کا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم قوم یا ملّت اس بنا پر ایک ہے کہ اس میں قدر مشترک اشتراک ایمان ہے۔ اشتراک علاقہ یا زبان یا نسل اقدار مشترک خواہ نہ بھی ہوں یہ تخیل بالکل نیا ہے۔ تیسرا تصور اسلام کی جغرافیائی شناخت کا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں یہ حق دیا جائے کہ وہ ان علاقوں میں خود مختار ہوں۔ یہ تین نئے تخیل ہیں۔ برصغیر کے بعض علماء نے ان تصورات کو بدعتیں سمجھا اور وہ کسی صورت میں ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی دو قومیں۔ اور مسلم قومیت کا کیا تصور؟ قوم کے اعتبار سے تو ہم ہندوستانی ہیں۔ ملت کے اعتبار سے ہم مسلمان ہیں یعنی وہ قوم اور ملت میں فرق کرتے تھے۔ علامہ اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام میں قوم اور ملت کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو بانیان پاکستان کے ذہن میں اسلام کی خاص تعبیر تھی۔ اس سے بعض علماء نے اختلاف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی اکثریت پاکستان کی تحریک کے خلاف تھی۔ علماء کسی نئی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ تغیر کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کے ہاں اسلام کی ایک مخصوص تعبیر تھی۔ اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس تصور کو عملی انداز میں کس طرح پیش کیا گیا تو وہ قرارداد مقاصد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری اسلامی شناخت اور آزادی کا چارٹر ہے۔ قرارداد مقاصد لیاقت علی خان ہی کے زمانے میں پاس ہوئی جو پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ ان کے عہد میں قرارداد مقاصد پاس ہو گئی اور ہم نے تعین کر لیا کہ کس قسم کا راستہ اختیار کرنا ہے یعنی اسلام کی کونسی تعبیر اختیار کرنی ہے۔ ایک طرح سے اس نکتہ پر ملت کا اجماع ہو گیا۔ اگر آپ روایتی فقہ لیں تو اس میں کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک انتخاب دوسرا نامزدگی اور تیسرا غصب۔ یعنی ہماری فقہ شرعی طور پر غصب کو بھی حکومت قائم کرنے کا جائز طریقہ قرار دیتی ہے گو شرط یہ لگاتی ہے کہ غاصب اسلامی قوانین کو جاری رکھے اور اسلام کے نفاذ میں خلل نہ آئے۔ انتخابات کا سلسلہ تو خلفائے راشدین کے زمانے ہی میں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد ریاست قائم کرنے کے جو طریقے سامنے آئے وہ ملوکیت اور نامزدگی یا غصب کی شکلوں میں تھے۔ ہم نے جب قرارداد مقاصد پاس کی تو ہم نے عہد کیا کہ ہم نے نامزدگی اور غصب کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم صرف انتخابات ہی کو لیں گے کیونکہ یہی طریقہ خلفائے راشدین کا تھا۔ یہ تصور ہے جس کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ اسلام کا جمہوریت سے تصادم نہیں۔ اگر آپ قرارداد مقاصد کو غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں انتخابات کے ساتھ بنیادی حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ اقلیتوں کے ساتھ کیا ہوگا۔ یعنی غیر مسلموں کے ساتھ آپ نے برابری کا سلوک کرنا ہے اس بنا پر کہ ان کے ساتھ اشتراک وطن ہے مسلمانوں پر قرارداد مقاصد کے تحت دوسری ذمہ داری ہے۔ یعنی مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی اشتراک ایمان کے اصول پر اور غیر مسلموں کے ساتھ یک جہتی اشتراک وطن کے اصول پر۔ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ مسلم قومیت اور پاکستانی قومیت یعنی اشتراک ایمان اور اشتراک وطن ہمارے ہاں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرارداد مقاصد کا تعلق روایتی فقہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق جدید اجتہاد سے ہے وہ اجتہاد خواہ ہمارے بانیوں کا تھا لیکن قوم نے اس کی تصدیق کی۔ ان پر اعتماد کیا اور لبیک کہا۔ پس قرارداد مقاصد ایک طرح سے اجماعِ اُمت ہے اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے۔ وہ اس اجماعِ اُمت کے خلاف جاتا ہے۔

لیاقت علی خان کا دور مختصر دور تھا۔ پاکستان تشکیل کے اعتبار سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا اور درمیان میں غیر ممالک کی ہزاروں میل کی وسعت تھی۔ اس لحاظ سے دونوں حصوں کا کسی ایک دستور پر اتفاق رائے قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ بنگالیوں کو باور کرایا گیا کہ گو ابھی اکثریت تھی بمقابلہ مغربی پاکستان کے لوگوں کے۔ لیکن وہ مساوات کے اصول پر آدھو آدھ کر لیں۔ یعنی آئین میں اسمبلی کی سیٹوں کی جو تعداد مغربی پاکستان کی ہو وہی مشرقی پاکستان کی ہو۔ بنگالیوں نے آخر کار اس اصول کو تسلیم کر لیا، اگر انہوں نے یہ تسلیم کیا تو اس بنا پر کیا کہ مسلم قومیت کا اصول مقدم ہے یعنی یہ بات نہیں کہ بنگالی زیادہ ہیں یا مغربی پاکستان کے لوگ زیادہ ہیں۔ بات یہ ہے کہ سب مسلمان ہیں۔ تو چلو آئین میں برابری کے اصول پر چلتے ہیں۔ یہ چودھری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ جس وقت یہ

آئین بنا اس وقت وہ وزیر اعظم تھے۔ جہاں تک قائداعظم کی تحریک پاکستان کا تعلق ہے یہ درست ہے کہ کانگریسی علماء نے ان کی مخالفت کی۔ اور احراری علماء نے بھی ان کی مخالفت کی ان پر کیچڑ اُچھالا۔ قائداعظم کی تحریک کے سبب منفی ذہن رکھنے والے علماء کا اثر ختم ہو گیا۔ کیونکہ مسلمانوں نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا۔ قائداعظم کے زمانے میں لیاقت علی خان کی جو مرکزی کابینہ بنی اس میں احمدی اور ہندو وزیر بھی شامل تھے۔ کوئی مذہبی امتیاز نہ تھا۔ غیر مسلموں سے انہوں نے برابری کا سلوک کیا۔ اگر ان میں میرٹ تھا تو انہیں بھی وزیر لیا گیا۔ علماء نے ایک مرتبہ پھر سیاسی طور پر قوت یا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ اینٹی احمدی موومنٹ تھی اس کے پیچھے بھی بعض سیاسی عناصر تھے۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ کو ختم کیا جائے پنجاب میں ایسے سیاست دان تھے جو اس کوشش میں تھے کہ مولویوں کو اکسا کر خواجہ ناظم الدین کو ختم کیا جائے۔ یہ وہ تحریک تھی جس کی بناء پر یہاں سب سے پہلے مارشل لاء لگا۔ یہ مارشل لاء جنرل اعظم کا مارشل لاء کہلاتا ہے۔ اس کے بعد منیر کمیٹی بنی جس نے پنجاب کی بدامنی کے بارے میں اپنی رپورٹ دی۔ اگر وہ رپورٹ آپ پڑھیں تو ظاہر ہو گا کہ علماء ان کے سامنے گواہوں کے طور پر پیش ہوئے تھے اور ان کا آپس میں اختلاف تھا لفظ "مسلم" کی تشریح پر۔ اس کمیٹی میں جسٹس منیر کے علاوہ جسٹس کیانی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ممبروں نے منیر کمیٹی رپورٹ تیار کی یعنی اس موقعہ پر پہلی مرتبہ ہم نے اسلام کو بطور سیاسی حربے کے استعمال کیا اور نتیجہ مارشل لاء تھا۔ آپ نے دیکھا کہ جب بھٹو کی حکومت کو گرانا مقصود تھا تو اُس وقت بھی نظامِ مصطفیٰ کی تحریک چلائی گئی نظامِ مصطفیٰؐ میں وہ جماعتیں بھی شامل ہو گئیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یا سیکولر تھی۔ سو ظاہر ہے اصل مقصد اسلامی نظام کا نفاذ نہیں، بھٹو کی حکومت کو گرانا تھا۔

1956ء کا آئین کتنی مشکلوں سے بنا تھا لیکن اس کا حشر یہ ہوا کہ اس وقت کوئی اور سیاسی جماعت اس پوزیشن میں نہیں تھی جو کہ مسلم لیگ کا مقابلہ کر سکتی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد مسلم لیگ میں اتنا انتشار آیا کہ لیڈروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا یعنی ہر شخص نے اقتدار کی خاطر دوسرے کی ٹانگ کھینچنا شروع کر دی۔ بد قسمتی سے ہماری سیاست نے یہ شکل اختیار کر لی۔ اس طرح آپ دیکھیں کہ تھوڑے عرصے کے بعد وزیراعظم بدلتے رہے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین آتے ہیں پھر چودھری

محمد علی آجاتے ہیں۔ پھر فیروز خان نون اور محمد علی بوگرہ پھر سہروردی آجاتے ہیں یعنی ہر سال یا دو سال کے بعد وزیراعظم بدل رہا ہے۔ انتشار کی یہ کیفیت تھی کہ کسی پر بھی اعتمار دیرپا ثابت نہیں ہوتا تھا۔ یعنی ایک تماشہ بن گیا تھا۔ جب بات سیاست دانوں کے ہاتھ سے نکل گئی تو وہ بیورو کریٹس کے ہاتھ میں آئی۔ ملک غلام محمد، چودھری محمد علی اور سکندر مرزا کا تعلق انتظامیہ سے تھا۔ یہ سیاست دان نہیں تھے۔ جب ان سے بات نہ بنی تو فوج آ گئی۔ پہلا مارشل لاء اینٹی احمدی تحریک کے سلسلے میں پنجاب میں لگا یہ بڑا سخت تھا۔ جس کو آج تک بعض لوگ نہیں بھولے۔ لیکن ہم نے اُس سے سبق نہیں سیکھا۔ جب ایوب خان میدان میں آئے اور مارشل لاء لگا تو 1956ء کے آئین کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ آمریت کا دور شروع ہوتا ہے۔ کہا گیا کہ 1956ء کے آئین میں صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکالا گیا کہ یہاں پر پارلیمانی نظام نہیں چل سکتا۔ یہ تصور پیش کیا گیا کہ ہمیں ایسی جمہوریت چاہیے جو ہماری جینئیس (مزاج) کے مطابق ہو۔ ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا تعارف کرانے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ بنیادی جمہوریت کا ڈھانچہ اٹھایا گیا۔ مرکزیت پر اصرار کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں صدارتی نظام کا دور شروع ہوا۔ بد قسمتی سے ملک میں جب بھی مختصر جمہوری دور آتا ہے تو اس میں جو نامور وکلاء ہیں وہ ہماری سیاست کا حصہ نہیں بنتے۔ ان ممتاز وکلاء کو اگر حصہ بنایا جاتا ہے تو آمریت کے دور میں بنایا جاتا ہے۔

اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں جو اچھے سے اچھے وکیل ہیں جو فوجی آمروں کو مشورہ دیتے رہے ہیں۔ آمروں کے زمانے ہی میں وہ وزارتِ قانون کا قلم دان سنبھالتے رہے ہیں۔ جب جمہوری دور آتا ہے تو دوسرے یا تیسرے درجے کے وکیل وزارت قانون کا عہدہ سنبھالتے ہیں۔ مثلاً اے کے بروہی۔ شریف الدین پیرزادہ، منظور قادر، شیخ خورشید احمد، ایس ایم ظفر۔

کبھی جمہوری نظام میں قوم کے کام نہ آسکے۔ ان کی خدمات سے جمہوریت میں فائدہ نہ اٹھایا گیا

اب آگے چلیں۔ ایوب خان کے دور میں پہلی مرتبہ قائداعظم کے رستے سے انحراف ہوا۔ اُسی دور میں سپریم کورٹ نے یہ رُول بنا دیا کہ جس وقت انقلاب کامیاب ہوتا

ہے تو بذاتِ خود ایک نیا قانونی نظام نافذ کرتا ہے۔ یعنی ایوب خان کی آمریت کو قانونی طور پر تحفظ دیا گیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت جو سپریم کورٹ کے جج صاحبان تھے انہیں شاید ہماری روایتی فقہ کا علم نہیں تھا۔ علم ہوتا تو وہ کہتے کہ اس سلسلے میں بہت سے مسلمان فقہاء بھی کہہ گئے ہیں کہ غصب اگر کامیاب ہو اور غاصب اسلام کے رستے پر قائم رہے تو وہ شرعی طور پر جائز ہوگا۔ کیونکہ وہ مغربی قوانین ہی سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے کیلسن(KELSON) ہی کے نظریے کا ذکر کیا۔ ایوب خان کے دور میں وسعتِ نظری نہ رہی قائداعظم کا تصورِ اسلام جو کہ وسعتِ نظری کا مظہر تھا اسی سے ہم نے انحراف کیا۔ اور اسی انحراف کے سبب کیا قباحتیں وجود میں آئیں۔ اس بات پر بھی ذرا غور کریں۔ سب سے پہلی قباحت یہ آئی کہ مسلم قومیت کا جو تصور تھا ہم نے اس کو پاش پاش کر دیا۔ باوجود اس کے کہ قائداعظم نے کہہ دیا تھا کہ پاکستان کی ایک ہی زبان ہوگی اور وہ اردو ہو گی۔ پس سب سے پہلے لسانی عصبیت اٹھی ہمارے بنگالی بھائیوں نے کہا کہ دو زبانیں ہوں گی۔ بنگالی بھی قومی زبان ہوگی تو یہ لسانی عصبیت کا فروغ پانا بھی انحراف تھا اس مسلم قومیت کے تصور سے۔ جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔ لسانی عصبیت کے ساتھ ساتھ علاقائی عصبیت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے آثار ایوب خان کے آخری دور میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہ صورت ہو گئی کہ حکومت پاکستان کے ارباب یوم اقبال پر تعطیل کا اعلان کرنے سے گھبراتے تھے۔ کیونکہ بنگالیوں کا یہ اصرار تھا کہ نذرالاسلام کو بھی یہ قومی درجہ دیا جائے حالانکہ وہ کلکتہ میں رہتا تھا۔ جب ایوب خان کے خلاف تحریک چلی تو اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ایوب خان نے اس زمانے (اسلامی نظریاتی کونسل) کا چیئرمین ایک ایسی شخصیت کو بنایا تھا جس کے اسلام کے متعلق غلط تصورات تھے۔ یہ پہلے کینیڈا میں پروفیسر تھے پھر امریکہ چلے گئے ان کا نام ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھا۔ ایوب خان کے خلاف جو تحریک چلائی گئی اس کا سیاسی پہلو تو تھا ہی۔ اس کا مذہبی پہلو یہ تھا کہ اس نے ایک ملحد کو اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ جن اختلافات کی بنیاد پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ملحد کہا گیا وہ دراصل علم کلام کے مسائل پر بحثیں تھیں۔ ان کا تعلق ہماری حقیقی زندگی یا سیاست سے قطعی نہ تھا۔ یہ تحریک جب اپنی انتہا تک پہنچی تو ایوب خان کو حکومت چھوڑنا پڑی۔ ایوب خاں نے اپنے بنائے ہوئے 1962ء کے آئین سے انحراف کیا۔ اس آئین کے تحت اگر ایوب خاں دستبردار ہوتا ہے تو سپیکر صدر بنتا ہے لیکن اس نے سپیکر کو صدر نہیں بنایا۔ اس نے یحییٰ خاں کو دعوت دی کہ تم آ کر

حکومت سنبھال لو۔ تو آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ قرارداد مقاصد کا انحراف کب سے ہونا شروع ہوا اور کس طرح ہوتا چلا آ رہا ہے۔

یحییٰ خاں آ کر کیا کرتے ہیں۔ اس کو عوامی سند تو حاصل نہیں تھی نہ یہ عوام کے ووٹوں سے آئے تھے۔ یہ عسکری آمر تھے۔ انہوں نے ہی پیرٹی کے اصول کو ختم کیا جس کا 62ء کے آئین میں بھی لحاظ رکھا گیا تھا یعنی ایوب خاں نے بھی اس کو مدنظر رکھا تھا۔ بعد میں ون یونٹ کو ختم کیا۔ پھر اپنی طرف سے آزادانہ انتخابات کروائے۔ ان انتخابات کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ لسانی اور علاقائی عصبیتوں کی بنیاد پر پاکستان دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ انتخابات میں جو مغربی پاکستان سے کامیاب ہوئے انہوں نے کہا "ادھر ہم، اُدھر تم"۔ اب اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ مسلم قومیت کا تصور کہاں گیا۔۔۔۔۔ اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں پھینک دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اندرا گاندھی کا یہ کہنا درست نہیں تھا۔ دو قومی نظریہ تو ختم نہیں ہوا۔ دو قومی نظریہ تو تب ختم ہوتا اگر بنگالی کہتے کہ ہم ہندوستان میں واپس جا کر اسکا حصہ بنتے ہیں۔ ختم اگر کچھ ہوا تو مسلم قومیت کا تصور ختم ہوا۔ دو قومیں تو پھر بھی رہیں۔ لیکن اشتراک ایمان کی بنیاد پر جو ہم ایک قوم بنے تھے، اس کو دھچکا اس طرح پہنچا کہ پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم نے قائداعظم کا راستہ چھوڑ دیا۔ ہم نے مسلم قومیت کے تصور کو خیر باد کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف آمریت ہی کے سبب ملک دو ٹکڑے ہوا۔ جو اقتدار کی جنگ پہلے جاری تھی وہ بھی اس سانحہ کی ذمہ دار ہے۔ سیاستدانوں نے بھی اسے تقسیم کیا اقتدار کی جنگ میں انہوں نے کہا کہ ملک توڑ لو لیکن ہم نے اقتدار نہیں چھوڑنا۔ جس وقت آپ ایسے راستے پر چل رہے ہوں جس میں کسی اصول کی پابندی نہیں تو نتیجہ اس کا یہ ہوگا جو آپ کے سامنے ہے۔

اب اس دور کو لیں جب وزیراعظم بھٹو صاحب تھے پیپلز پارٹی کا وجود میں آنا مسلم لیگ کے انتشار کے سبب تھا۔ ایوب خاں نے محترمہ فاطمہ جناح کا مقابلہ بنیادی جمہوریت کے تحت کیا اور وہ ہار گئیں تو اس وقت بھی لیگ کو ایوب خاں نے ہائی جیک کر رکھا تھا۔ انہوں نے کنونشن لیگ بنائی ہوئی تھی۔ بھٹو بھی تو کنونشن مسلم لیگ ہی کے فرد تھے اور کنونشن مسلم لیگی تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ بھٹو تمہارے ہم عصر ہیں۔ اس کو کونسل مسلم لیگ میں لاؤ کیونکہ مسلم لیگ ہی قائداعظم کی جماعت ہے اور تم نوجوان

رستہ تلاش کر لو گے۔ میں نے بھٹو صاحب کو محترمہ فاطمہ جناح کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ اگر میں مسلم لیگ میں آگیا تو اس میں ایسے افراد ہیں جو میرے پاؤں کے نیچے گھاس تک نہیں اگنے دیں گے۔ ان کا اشارہ غالباً میاں ممتاز دولتانہ اور خان عبدالقیوم خاں کی طرف تھا۔ کونسل مسلم لیگ بھی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی ایک قیوم لیگ اور دوسری دولتانہ لیگ۔ تو بھٹو نہیں آئے۔ لیگ کے انتشار کے سبب ہی بھٹو کو پی پی پی بنانی پڑی۔ جو کام مسلم لیگ کو کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی پاکستان کو فلاحی ریاست بنانا۔ روٹی کپڑا مکان۔ غربت کو دور کرنا۔ جس طرح علامہ اقبال نے قائداعظم کو خطوط میں لکھا تھا کہ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بناؤ۔ اور غریبوں کے مسائل حل کرو۔ اس طرف تو کسی مسلم لیگی لیڈر نے توجہ نہیں دی۔ مسلم لیگی آپس میں لڑتے رہتے تھے اسی انتشاری کیفیت کی وجہ سے یہ نعرہ بھٹو صاحب نے لے لیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس ضمن میں کچھ ہوا نہیں۔ مگر نعرہ تو تھا۔ اور اسی نعرے کی بنیاد پر انہوں نے ملک میں آندھی چلا دی۔ اقتدار ان کے ہاتھ میں آگیا۔ جب اقتدار آیا تو ایک طرف ساری اپوزیشن ہو گئی اور ایک طرف پی پی پی ہو گئی۔ اور پھر ساری اپوزیشن نے بھٹو کو ہٹانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسلام کو خطرے میں ڈال دیا۔ حالانکہ آج تک اسلام خطرے میں نہیں ہوا۔ خطرے میں اگر ہوئے ہیں تو مسلمان ہوئے ہیں۔ اسلام تو ان کی مدد کو آتا رہا ہے۔ لیکن یہاں الٹ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ جی اسلام خطرے میں آگیا ہے اس لیے حکومت کو گراؤ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ بھٹو نے اپنے آخری دور میں اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی کا اعلان کیا۔ ریس کورس میں گھوڑ دوڑ اور شراب بند کر دی۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ سو انہوں نے اپنی طرف سے یوں اسلام نافذ کیا۔ وہ اپنے اقتدار کو بچانے کی خاطر سب کچھ کرتے چلے گئے۔ اگر ان کو نظام مصطفےٰ والے کہتے حدود آرڈیننس نافذ کردو، تو وہ بھی کر دیتے کیونکہ وہ تو اپنا اقتدار بچانا چاہتے تھے۔ یہاں آپ دیکھ لیں کہ اسلام کو کیونکر حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پی پی پی کے حکمرانوں اور اپوزیشن کے درمیان کوئی سیاسی تصفیہ ہو جاتا۔ لیکن اپوزیشن بھی تصفیہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ اس حکومت کو ہی ختم کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر مارشل لاء اس ملک میں لگا۔ اور یہ ضیاء الحق کا مارشل لاء تھا جو سب سے طویل عرصے تک رہا۔ ہمیشہ جنگ اقتدار کی ہوتی رہی ہے۔ اس میں عوام کی بہبود کا پہلو سامنے نہیں آیا۔ عوام کی مینڈیٹ کا احترام کرنے کا خیال کسی

کے ذہن میں نہیں آیا۔ جب بھی انتخابات ہوئے تو یہی ہوا کہ میرا جو رقیب ہے جس کے خلاف میں الیکشن لڑ رہا ہوں وہ میرا مخالف ہے۔ اسی سلسلے میں میرے دل میں اس کا کوئی احترام نہیں اور نہ اس کے دل میں میرا کوئی احترام ہے اس لیے اسے انتخاب تو نہیں کہا جا سکتا یہ تو سول وار ہو گئی تو لوگوں کی بہبود کہاں گئی۔ اس لیے بعض لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم تیسری دنیا کی اقوام میں سے ہیں۔ جمہوریت کے اہل نہیں۔ کنٹرولڈ جمہوریت کے اہل ہیں۔ حالانکہ کنٹرولڈ جمہوریت کا بھی یہاں تجربہ ہو چکا ہے اور کھلی جمہوریت کا بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ آمریت کا بھی تجربہ ہو چکا ہے آپ نے دیکھا کہ آمریت کی صورت میں کس طرح 11 سال کی مدت گذری۔ ضیاء الحق نے کس قسم کا اسلام نافذ کیا اور اس کے مقاصد کیا تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضیاء الحق میں ذاتی خصوصیات تھیں۔ مثلاً وہ نمازی تھا۔ اس میں انکساری تھی۔ اس کا تعلق تو ذاتی اخلاق کے ساتھ ہے۔ اگر آپ کے ملک کا صدر یا سربراہ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ اور ساتھ آپ کو کہتا ہے کہ میں نے آپ کو آزادی نہیں دینی۔ تو اس کے پانچ وقت کے نمازی ہونے کا تعلق اس کی اپنی ذات سے ہے اس کا اسے اجر ملے گا۔ میں نے آپ کے سامنے پاکستان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ کہ یہاں کس طرح آمر آتے رہے ہیں۔ اگر آپ پاکستان کی 44 سالہ تاریخ کو سامنے رکھیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ہم نے اس دوران کیا کیا۔ جمہوریت سے زیادہ آمریت رہی ہے۔ یعنی پاکستان کی زندگی آدھی سے زیادہ عسکری آمریت کے تحت گذری ہے۔ اس دوران ہم نے ملک کے دو ٹکڑے بھی کر دیئے۔ اب جب تک ہم اس بات کو پلے نہیں باندھ لیتے کہ جمہوریت کے بعض اصول ہیں اور ان کے مطابق ہی ہم نے چلنا ہے۔ ہمارا مستقبل تاریک ہے۔ سب سے اہم چیز جمہوریت کو چلانے کے لیے یہ ہے۔ عوامی مینڈیٹ کا احترام کیا جائے خواہ کوئی بھی کامیاب ہو کے آئے۔ اس میں دشمنی کی بات نہیں ہے۔ ہار اور جیت کو زندگی اور موت کا مقصد نہیں بنانا چاہیئے۔ یہ جمہوریت کا طریقہ نہیں ہے۔ جمہوریت تبھی چل سکتی ہے۔ اگر آپ میں رواداری ہو۔ اگر آپ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے تو پھر آپ جمہوریت کے مستحق نہیں ہیں۔ پھر تو یہاں پر مستقل آمریت ہی کا دور رہے گا۔

آمریت جن ملکوں میں رہی ہے وہ عسکری نوعیت کی رہی۔ اب اگر سپین میں جنرل فرانکو جیسا شخص تاحیات صدر رہ سکتا ہے۔ اگر پرتیگال میں سالازار جیسا شخص

تاحیات صدر رہ سکتا ہے یا ٹیٹو۔ یہ مغربی ممالک ہیں جو ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہم تو تیسری دنیا کے لوگ ہیں ہم اقتصادی یا ٹیکنیکی طور پر آزاد نہیں ہیں ہم تو قرضوں پر زندہ ہیں۔ جو قوم و ملک دوسروں سے قرضے لے کر زندہ ہو اس کو آپ کس کیٹگری میں شامل کریں گے۔ وہ کوئی باعزت قوم تو نہیں سمجھی جائے گی۔

جہاں تک بے نظیر بھٹو صاحبہ کے دور کا تعلق ہے۔ تو وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جو پارٹی بنائی وہ کاغذی پارٹی نہیں تھی وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر نہیں بنائی گئی تھی وہ عوامی پارٹی بنی اس کے سلوگنوں نے عوام کو مسحور کیا۔ میرا یہ شروع سے نظریہ رہا ہے کہ اس ملک میں صرف دو سیاسی پارٹیاں ہونی چاہئیں۔ اگر ایک پیپلز پارٹی ہے تو دوسری مسلم لیگ ہو مسلم لیگ اس لیے ضروری ہے کہ یہ قائداعظم کی میراث ہے۔ بانیانِ پاکستان کا تعلق مسلم لیگ سے رہا ہے۔ ہر محب وطن ذہنی طور پر مسلم لیگی ہی ہوگا۔ چاہے وہ کسی بھی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔ یہاں جمہوریت اس وقت ہی چل سکتی ہے جب یہاں دو جماعتی نظام ہو۔ پی پی پی اور مسلم لیگ کے علاوہ جو جماعتیں ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنائیں۔ بلکہ وہ اپنے نظریوں کی بنا پر ان دونوں میں سے کسی ایک پارٹی میں شامل ہو جائیں اور اس کے تحت انتخابات میں حصہ لیا جائے۔

ضیاء الحق کی بھی ایک لابی ہے کیونکہ جس کی بھی موت غیر طبعی ماحول میں ہوئی ہو اس کے ساتھ ہماری ہمدردیاں ہو جاتی ہیں۔ جس طرح بھٹو یا ضیاء الحق کی اموات ہوئیں۔ وہ دونوں ہم نے شہید بنا دیئے۔ اس وقت پی پی والے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم بھٹو کے مشن کو پورا کریں گے۔ بھٹو کا مشن تو سوشلائزیشن تھا۔ موجودہ پی پی پی کے لیڈران تو اس سے منحرف ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جو ضیاء الحق کے حامی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ضیاء شہید کا مشن پورا کریں گے۔ تو ان کا مشن تو جمہوریت کے خلاف تھا۔ انہوں نے یوم اقبال کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں حیران ہوں کہ اس ملک کے لوگوں کے ذہن میں سے جمہوریت کا کیڑا کیوں نہیں نکلتا۔ تو جو کہتے ہیں کہ ضیاء الحق کا مشن پورا کریں گے وہ بھی اس میں مخلص نہیں ہیں کیونکہ ضیاء کا مشن جمہوریت سازی نہیں جمہوریت کی نفی یا جمہوریت سوزی تھا۔ انہوں نے تو غیر جماعتی انتخابات کروائے۔ پھر جو نیجو وزیراعظم بنے تو ان کو نہایت بے عزتی کر کے باہر نکال دیا۔ تو ضیاء الحق کا مشن آخر کیا

ہے؟ ہم ان دونوں مرحوموں کی لاشیں کھینچ رہے ہیں۔ اگر ہم ان کے مشن کو پورا کرنے کی بات کرتے ہیں تو ان دونوں کا مشن قرارداد مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اب بے نظیر کے وزارت عظمیٰ کے دور کی طرف آئیے۔ اس دور میں بھی شروع سے آخر تک اقتدار کی جنگ جاری رہی۔ ہم نے اپنے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ان کا اور مسلم لیگ کا گرینڈ الائنس کیوں نہیں بن سکتا تھا۔ پبلک مینڈیٹ کا احترام کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پی پی پی نے برسراقتدار آنے کے بعد یہ سوچا کہ یہ جو آئی جے آئی والے ہیں ان کا بخیہ ادھیڑ دیا جائے اس کے بعد یہ صورت ہوئی کہ دونوں نے ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اسی کشمکش اور محاذ آرائی میں کوئی قانون سازی نہ ہوئی جس کا تعلق عوام کی بہبود کے ساتھ ہو۔ اب تک تو ہم نے اپنی تاریخ میں قائداعظم کے نظریات سے انحراف کیا ہے اور کرتے چلے آرہے ہیں۔ خواہ اس کی ذمہ داری آپ کسی پر بھی ڈالیں لیکن انحراف ہوتا چلا گیا ہے اور اسی انحراف کے سبب جو وسیع النظری پاکستان کے ابتدائی دور میں دیکھنے میں آئی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔ آمریت کے ادوار کی وجہ سے ہم آج زیادہ قدامت پسند ہیں۔ قدامت پسندی تو ہمیں قائداعظم کے نظریات کے ساتھ رکھنی چاہیئے تھی لیکن ہم نے وسیع النظری کو چھوڑ کر علاقہ پرستی، نسل پرستی یا زبان پرستی کی قدامت پسندی قبول کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ٹوٹا۔ اور اب جو حالت سندھ میں ہے اور جو نفرت کی آندھی وہاں چلی ہوئی ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے آئندہ کیا کرنا ہے۔ قائداعظم کے راستے سے ہٹ کر ہم منتشر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ایسا کوئی لیڈر نہیں جو ہمیں سمیٹ سکے محبت کی بنا پر۔ اصل میں جب رواداری ختم ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے لیے نفرت و حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کس پر اعتماد نہیں رہتا۔ ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جب کوئی بھی قابل اعتماد نہ رہے تو پھر آپ کا معاشرہ کس قسم کا ہوگا۔ معاشرہ تتر بتر ہو جائے گا۔ منتشر ہو جائے گا۔ یہی کیفیت اس وقت ہماری ہے۔

چند اور باتیں

جہاں تک میرے مستقبل کے پروگرام کا تعلق ہے تو میں اپنی تین چار کتابیں مکمل کرنا چاہتا ہوں جو حضرت علامہ کے نظریات پر مبنی ہیں کچھ میرے اپنے لیکچرز ہیں جو میں نے علامہ کے بارے میں وقتاً فوقتاً دیئے۔ ان کو ترتیب دینا چاہتا ہوں۔ فی الحال سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ مجھے کوئی ایسی راہ دکھائی نہیں دے رہی جس میں میرے جیسا کوئی شخص مثبت کردار ادا کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہمارے ملک کا سیاسی نقشہ تشویشناک ہے۔

ایک دو واقعات جو بیان کرنے سے رہ گئے تھے ان کا ذکر کروں گا۔ حضرت علامہ اقبال "بھوپال میں بجلی کا علاج کروانے جایا کرتے تھے۔ یہ ان کی وفات سے دو برس پہلے کی بات ہے۔ 36ء میں تو آپ اکیلے گئے۔ البتہ 37ء میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ان کی کتنی عزت تھی۔ نواب بھوپال نے ان کے لیے وظیفہ بھی مقرر کیا ہوا تھا۔ سرسید کے خاندان سے ان کی کتنی گہری وابستگی، محبت اور شفقت تھی۔ اس کا نظارہ میں نے دیکھا کہ وہ سرراس مسعود سے کتنی محبت کرتے تھے جو سرسید کے پوتے تھے۔

ان کے ہاتھ تک چومتے تھے۔ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ مجھے جب کوئی شخص ملتا ہے کہ علامہ کی نسبت سے مجھے اس طرح ملتے ہیں جیسے کوئی پیرومرشد سے ملے۔ میرے لیے بعض اوقات یہ بات پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھے سرراس مسعود کے صاحبزادے سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان کو پہچانتا نہیں تھا۔ وہ غالباً آج کل دبئی یا ابوظہبی میں ہوتے ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا کہ یہ سرراس مسعود کے صاحبزادے ہیں تو میں نے بھی بے اختیار ان کا ہاتھ چوم لیا۔ میں بھوپال کا ذکر کر رہا تھا۔ وہاں جب میں علامہ کے ساتھ گیا تو سروجنی نائیڈو بھی وہاں تھیں۔ وہ بلبل ہند

کہلاتی تھیں کیونکہ وہ معروف شاعرہ تھیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہوا ہے۔ جب وہ علامہ سے ملاقات کے لیے آئیں تو علامہ نے مجھے بھی ان سے ملوایا کیونکہ علامہ مجھے اکثر اہم شخصیات سے ملاقات کرایا کرتے تھے۔

سروجنی نائیڈو علامہ سے لندن میں اپنی طالب علمی کے زمانے کی باتیں کرتی رہیں اور دونوں خوب ہنستے رہے۔ سروجنی نائیڈو علامہ اقبال کی جوانی کے زمانے سے انہیں جانتی تھین جب اقبال کیمبرج میں زیر تعلیم تھے تو اس زمانے میں سروجنی نائیڈو لندن میں پڑھتی تھیں۔

علامہ اقبال کے بارے میں چند سوال

س علامہ اقبال کی اولین اور بنیادی شناخت بحیثیت شاعر کے ہے ۔ دیگر زبانوں کے علاوہ ان کا اردو ' فارسی شاعری کا مطالعہ بہت گہرا تھا مگر سبھی سوانح نگار بس دوچار شاعروں کا نام لیتے ہیں مثلاً مولانا روم یا حافظ شیرازی ۔ کیا آپ کے حافظے میں کوئی ایسی نشست ہے جس میں علامہ نے اہل ادب سے فارسی اور اردو شاعری پر مجموعی حیثیت میں گفتگو کی ہو یا متفرق شاعروں پر مثبت یا منفی رائے دی ہو؟

ج میرے ذہن میں کوئی ایسی مخصوص نشست تو نہیں جس میں علامہ اقبال نے فارسی ' اردو اور عربی کے مختلف شعرا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو مگر وہ وقتاً" فوقتاً" اپنے اقوال تحریروں یا خطوط میں ان کے بارے میں اپنی آرا کا اظہار کرتے رہتے تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اپنے آخری ایام میں پنجابی صوفی شعرا بالخصوص بلھے شاہ کا کلام سننا بہت پسند کرتے تھے۔ ان ایام میں ان کا ایک ملازم دیوان علی ہوا کرتا تھا جس کو گانے کا بڑا شوق تھا۔ اس سے وہ بلھے شاہ کی کافیاں سنتے تھے ۔

میں نے انہیں دیوان علی سے ہیر وارث شاہ بھی سنتے دیکھا ہے۔ اردو شعرا میں وہ تغزل کے میدان میں غالب کے مقام سے بخوبی آشنا تھے۔ انہوں نے ان کے شاعرانہ حسن کا موازنہ جرمن شاعر گوئٹے سے کیا ہے البتہ غالب کے کلام کے ایک پہلو پر میں نے چوہدری محمد حسین کے سامنے تبصرہ کرتے ہوئے سنا ہے کہتے تھے ۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ غالب نے ہندوستان میں مسلم سلطنت کا زوال اور غدر کے دوران دہلی میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی لیکن ان کے کلام میں اس المیے کا کوئی ذکر نہیں ملتا سوائے ایک آدھ شعر کے جس کا اشارہ غالباً محمد شاہ ظفر کی طرف ہے ۔ وہ شعر یہ ہے ---

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اقبال' غالب کے فارسی کلام کے پرستار تھے کیونکہ ان کے نزدیک غالب کا فارسی کلام

اردو کلام سے زیادہ بلند پایہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ادبی حلقوں کو غالب کے فارسی کلام کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ جہاں تک برصغیر کے فارسی شعرا کا تعلق ہے علامہ اقبال عبدالقادر بیدل کو اس خطے کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ فارسی شعرا میں اپنے ہم عصر مگر عمر میں بڑے شاعر مولانا گرامی کی بے حد تعریف کرتے تھے ان شخصیتوں کے علاوہ علامہ اقبال نے برصغیر کے جن اردو شاعروں کی تعریف کی ہے ان کا تعلق یہاں کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے ہے یعنی حالی، اکبر الہ آبادی اور شبلی یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی تمدنی عظمت کا احساس دلا کر ان میں بیداری کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال خود بھی برصغیر میں احیائے اسلام کی اس شاعرانہ لڑی میں پروئے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک نئی نسل کی شاعری کا تعلق ہے اقبال، محمد دین تاثیر اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے اشعار کو پسند کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ دونوں نوجوان تھے اور اکثر اقبال کی صحبت میں بھی بیٹھتے تھے۔ دیگر جدید شعرا مثلاً ن م راشد، جوش، جگر، اختر شیرانی، فیض احمد فیض وغیرہ کو میں نے کبھی علامہ کی صحبت میں بیٹھے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی اقبال نے ان شعرا کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جہاں تک عربی اور فارسی شاعری کا تعلق ہے، علامہ فارسی کے تمام عظیم شاعروں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے البتہ حافظ کی وجودی شاعری کے سخت خلاف تھے۔ جہاں تک جلال الدین رومی کا تعلق ہے انہیں اقبال نے اپنا روحانی مرشد قرار دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ رومی نہ صرف اقبال کی طرح پیغامبر شاعر تھے بلکہ اقبال نے اپنے خودی کے فلسفے کی تائید بھی کلام رومی ہی میں دریافت کی تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شاعری برائے شاعری یا برائے فن اقبال کا منتہائے نظر نہ تھا کیونکہ وہ شاعری کو بطور وسیلے کے استعمال کرتے تھے تاکہ اپنا پیغام قاری تک پہنچا سکیں۔ انہیں یہ بھی خیال تھا کہ شاید آنے والی نسلیں مجھے شاعر نہ سمجھیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال نے اردو، فارسی، عربی یا پنجابی زبان کے صرف ان شعرا کی تعریف کی ہے یا صرف وہی شعرا ان کی نگاہ معیار میں قبولیت حاصل کرسکے جو پیغامبر تھے اور جن کی شاعری ایک طرح کا الہام تھا۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ فارسی کے مقابلے میں اقبال نے بعض عربی شعرا کے بے ساختہ پن کی تعریف کی ہے۔

مطلب یہ کہ عربی شعرا خواہ ان کا تعلق قبل از اسلام زمانہ جاہلیت سے ہو یا بعد از

اسلام عربی شعرا کے انداز سخن میں جو محترک یعنی شدت عمل (Dynamic) کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ فارسی شاعری کے ابہام کے مقابلے میں اقبال کو زیادہ پسند ہے حالانکہ انہوں نے خود ہی فرما رکھا ہے کہ کبھی کبھار مجھے شاعری میں ابہام بھی بہت پسند آتا ہے اقبال نے بعض مغربی شعرا کی بھی تعریف   جن کا تعلق خصوصی طور پر جرمنی یا انگلستان سے ہے ان میں اقبال کے نزدیک سب   زیادہ بلند مقام گوئٹے کا ہے۔ اقبال سنسکرت اور ہندی زبانوں سے بھی واقف تھے لیکن سنسکرتی یا ہندی شاعری میں بھی ان کے نزدیک ہری بھرتری کی طرح وہی شاعر مقبول تھے جن کے کلام کے دوش پر کوئی نہ کوئی پیغام تھا۔ اقبال نے اپنی تصنیف جاوید نامے میں جن شعرا کو خاص مقامات سے نوازا ہے وہ رومی، وشوامتر، غالب، منصور حلاج، طاہرہ قرۃ العین نطشے، شمس النساء،   غنی کاشمیری، بھرتری ہری اور ناصر خسرو۔

ان کے نزدیک ایسی شاعری جو انسان کو حیات سے فرار اختیار کرنے کی ترغیب دے یا اس پر نشے کی کیفیت طاری کرکے اسے مدہوش کردے وہ شاعری نہیں بلکہ ایک ایسا سحر ہے جو انسان کو مفلوج کر دیتا ہے۔

س علامہ اقبال کے ہم نشینوں میں اہل علم بھی ہیں، فلسفہ، تاریخ اور سیاست سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی مگر ان کے معاصر شاعروں کا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ اس دور کے شعرا اپنے عہد کے عظیم شاعر کی محفل میں شامل ہوتے ہوں؟

ج اس ضمن میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اقبال کی زندگی میں بعض ایسے شعرا نظر آتے ہیں جن کی صحبت میں بیٹھ کر اقبال نے فخر محسوس کیا مثلاً مولانا حالی، مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی۔ یہ سب حضرات علامہ سے عمر میں بہت بڑے تھے اور اقبال ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ علامہ کی لاہور کی محفلوں میں بیٹھنے والے مولانا عبدالقادر گرامی بھی فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے مگر علامہ کے جگری دوست بھی تھے۔ دوسری صف میں وہ شعرا آتے ہیں جو اقبال سے عمر میں بہت چھوٹے تھے اور جن کے متعلق اقبال کی خواہش تھی کہ وہ مسلمانوں کے قومی، تمدنی اور ادبی احیاء کے تسلسل کو جاری رکھیں۔ ان میں سے جنہیں میں نے اکثر حضرت علامہ کی صحبت میں دیکھا ہے وہ تاثیر اور صوفی تبسم ہی تھے۔ جوش کی رسائی بھی اقبال تک تھی۔ جب وہ نوکری کی تلاش میں حیدر آباد دکن گئے تو اقبال سے مہاراجہ کرشن پرشاد کے نام تعارفی اور سفارشی خط

لے کر گئے تھے۔ اس خط کے علاوہ جوش، جگر مراد آبادی یا دیگر ایسے شاعروں کو میں نے کبھی اقبال کی صحبت میں بیٹھے نہیں دیکھا۔ دراصل یہ سب شعرا مشاعروں کے شاعر تھے اور اقبال اس دور سے گذر چکے تھے۔

س ابتدائی زمانے میں لاہور کے چند مشاعروں میں اقبال کی شرکت کا تو پتہ چلتا ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس زمانے کے کوئی شاعران کے قریب بھی تھے یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں تھا تو کیوں؟

ج اقبال کا مشاعروں میں شامل ہونے کا ذکر ۱۹۰۵ء سے قبل یعنی ان کے اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر انگلستان جانے سے پہلے ملتا ہے۔ ہمیں سر عبدالقادر کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے شعرگوئی کا سلسلہ غالباً فرسٹ ایئر میں قدم رکھتے ہی شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ سیالکوٹ کے مرے کالج میں زیر تعلیم تھے اور عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس تھی۔ اس دور میں کالج کے مشاعروں میں حصہ لیا ہو گا، یہی وہ دور ہے جب آپ نے خط و کتابت کے ذریعے حضرت داغ سے اپنے کلام کی اصلاح لی۔ ظاہر ہے اقبال کا ابتدائی کلام تقریباً سارے کا سارا عشق مجازی سے متعلق اور داغ کے رنگ میں تھا گو بقول خلیفہ عبدالحکیم اس کلام میں بھی کہیں کہیں اقبال کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لاہور میں اقبال کا مشاعروں میں شریک ہونا اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ تھرڈائر میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ایسے مشاعرے بھاٹی دروازے کے اندر ہوا کرتے تھے۔ جن کی تفصیل خلیفہ احمد شجاع مرحوم نے اپنے ایک مضمون "لاہور کا چلسی" میں دے رکھی ہے۔

ان مشاعروں میں میرے خیال کے مطابق جو شعرا شریک ہوتے تھے وہ غالباً نوجوان تھے جن کی تفصیل بعد میں اس لئے نہیں ملتی کیونکہ ان میں شائد کوئی بھی ایسا شاعر نہ نکلا جس نے شاعری میں کوئی بلند مقام حاصل کیا ہو۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان مشاعروں میں بعض ممتاز اساتذہ مثلاً ارشد گورگانی بھی شرکت کرتے تھے۔ لاہور میں غالباً پہلی مرتبہ اقبال نے مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی، جب آپ اس شعر پر پہنچے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو ارشد گورگانی بے اختیار ہو کر داد دینے لگے اور انہیں محبت و قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا ---- لاہور میں دراصل حالی اور آزاد نے شعر کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور ارشد جو ایک برجستہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کے نقاد بھی تھے، لاہور آتے جاتے رہتے تھے بلکہ کچھ عرصہ کے لئے لاہور ہی میں اقامت پذیر ہو گئے تھے ---- اگلے برس یعنی ۱۸۹۶ء میں محمد دین فوق گھڑتل ضلع سیالکوٹ سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن مشاعرہ کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اس شام محفل میں اقبال موجود تھے۔ فوق نے بھی اپنی غزل پڑھی۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں میں ایسی دوستی پیدا ہو گئی جو تاحیات اقبال قائم رہی۔

فوق نے بعد میں شاعر سے بڑھ کر ایک ادیب، مورخ اور اخبار نویس کی حیثیت سے شہرت پائی مگر اقبال کے گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے دور میں ابھی تک انہوں نے اخبار پنجہ فولاد، کشمیری میگزین اور اخبار کشمیری نہ نکالے تھے، گو اسی زمانے میں لاہور میں قائم شدہ انجمن کشمیری مسلمانان کے اجلاسوں میں فوق بڑی سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور اقبال بھی اس کی مجالس میں نظر آنے لگے۔ اقبال نے ابتداء میں کشمیر کے متعلق جو اشعار اور قطعات کہے، وہ اسی انجمن کے اجلاسوں میں پڑھے گئے تھے اور بعد میں فوق کے اخبارات میں ان کی اشاعت ہوئی۔

یہی وہ دور ہے جب اقبال سر عبدالقادر سے ملے اور ان کا ابتدائی کلام سر عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" میں شائع ہونا شروع ہوا لیکن مشاعروں کا اقبال جلد ہی اس مقام سے گزر گیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اپنا کلام سنانے کی ابتداء کی، یہ ان کے بعض احباب کی ترغیب کا نتیجہ تھا۔

ابتدا ۱۹۰۱ء کے جلسے سے ہوئی اور پھر یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہ اقبال کی قومی شاعری کی ابتدا تھی جو ایک اعتبار سے ماتم سے شروع ہوئی۔ آپ نے غزل کہنا چھوڑ کر نظم یا مثنوی کے انداز کو اپنایا۔ اس ابتدائی دور کی نظموں سے ظاہر ہے کہ وہ حالی کی طرح مسلم قوم کے سیاسی، علمی اور ادبی زوال کا ماتم کر رہے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب حضرت علامہ کی وابستگی ہندوستان میں احیائے اسلام کے بزرگ شاعروں سے ہوئی مثلاً مولانا حالی سے پہلی ملاقات انجمن ہی کے ایک

جلسے میں ہوئی تھی جہاں حالی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اپنی تحریر کردہ نظم نہ سنا سکے اور مجمع کے سامنے نوجوان اقبال ہی کو ان کی نظم سنانے کے لئے کہا گیا۔ اقبال سٹیج پر آئے اور حالی کی نظم سنانے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی نہایت خوش الحانی سے پیش کی۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

اس کے بعد انہوں نے اپنی دلکش اور شیریں آواز میں حالی کی پوری نظم 'مادر پنجاب انجمن" حاضرین کو سنائی بہرحال جن مشاعروں میں اقبال شریک ہوئے تھے ان میں ان کے دیگر ہم عصر شعرا میں سے کسی نے بھی ایسا نام پیدا نہیں کیا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ اقبال کے ہم عصر شاعر تھے۔ البتہ ان کے کئی ان احباب کا ذکر ملتا ہے جو اقبال کے ساتھ بطور ہمراہی ان مشاعروں میں شریک ہوئے تھے مثلاً شیخ عبدالقادر اور محمد دین فوق وغیرہ۔

س اردو شاعری میں چند نام ایسے ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا مگر اقبال کے سوانح نگاروں نے اقبال کی ان کے بارے میں کوئی رائے نہیں بتائی مثلاً میر تقی میر' میرانیس' نظیر اکبر آبادی' حالی وغیرہ

ج جہاں تک الطاف حسین حالی کا تعلق ہے علامہ ان کے بہت مداح تھے۔ جس انداز سخن کی ابتداء حالی نے کی تھی' اقبال نے اس کو انتہا تک پہنچایا۔ اگر کوئی شاعر صحیح معنوں میں اقبال کا پیشرو ہے تو وہ حالی ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اپنے بچپن کا مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب علامہ نے اپنے آخری ایام میں مجھے مسدس حالی سنانے کے لئے کہا۔ جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے مجھے ترغیب دینے کے لئے مسدس کا پہلا مصرعہ پڑھا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو اقبال زاروقطار رونے لگے' سو ظاہر ہے ان کی نگاہ میں حالی کی بڑی قدرو منزلت تھی کیونکہ اقبال کے شعرو فکر کا تعلق حالی ہی کے مکتبہ شعرو فکر سے تھا۔

جہاں تک میر تقی میر کا تعلق ہے۔ شاید ان کے صوفی مسلک سے اقبال کا اختلاف تھا جس کی وجہ سے اقبال کے ہاں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ نظیر اکبر آبادی کو اقبال ملے تو ہونگے لیکن شاید اقبال نے ان کی شاعری کو احیاء کی شاعری کے زمرے میں نہ سمجھا ہو۔ اقبال کے ہاں میر انیس کا ذکر ایک جگہ آتا ہے وہ مسلمانوں کے علمی و ادبی زوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ زوال میرانیس کے مرثیوں پر ختم ہوا۔

یعنی ان کے نزدیک جب کوئی قوم انتہائی ذلت کو پہنچتی ہے تو اس کا ادب مرثیہ گوئی پر ختم ہوتا ہے اقبال نے شاید اس لئے میرانیس کو اہمیت نہ دی کہ انہوں نے صرف قوم کی میت پر نوحہ کناں ہونے پر اکتفا کیا۔

س اردو ادب میں ترقی پسند تحریک علامہ کی زندگی میں باقاعدہ آغاز کر چکی تھی۔ لکھنؤ میں پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں منعقد ہو چکی تھی اور یہ تحریک بڑی تیزی کے ساتھ لکھنے والوں کو متاثر کر رہی تھی اور بحث مباحثے کا مرکز بنی ہوئی تھی لیکن علامہ اقبال کے حوالے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس سے بالکل بے نیاز تھے حالانکہ ان کی شاعری میں اس تحریک کے اثرات بہت پہلے سے موجود تھے۔ کیا کبھی انہوں نے اس تحریک کے بارے میں اپنے رائے دی جو آپ کے علم میں ہو۔

ج یہ درست ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسندی کی تحریک علامہ کی زندگی کے آخری دور میں شروع ہوئی۔ یہ تحریک کا ابتدائی زمانہ تھا اس کی ابتدا بلینک ورس یعنی آزاد شاعری سے ہوئی جس کو بزرگ شاعروں نے تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ بہرحال پنجاب میں اس تحریک سے متعلق شعرا کے جو نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں' ان میں سے بعض حضرت علامہ سے ضرور ملتے رہتے تھے۔ تاثیر اور صوفی تبسم کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی شاعر تصدق حسین خالد بھی تھے جنہوں نے نئے انداز تحریر کو اپنایا۔ میرے اپنے مطالعے کے مطابق ترقی پسند تحریک سے متعلق علامہ نے کبھی بھی اظہار خیال نہیں فرمایا۔ میرے خیال میں اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً تحریک بہت ہی ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کا کسی نے نوٹس نہ لیا پھر یہ کہ ردیف قافیے سے ہٹ کر آزاد شعرگوئی کی علمبردار تھی جس سے خالصتاً" مغرب کے ادبی اثرات کا نتیجہ سمجھتے ہوئے شرف قبولیت نہ بخشا گیا نیز یہ کہ اس تحریک کا تعلق ابتدا ہی

سے سوشلزم یا کمیونزم اور ہندی قوم پرستی سے تھا جن نظریات کو کم از کم اقبال مسلمانوں کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے کیونکہ وہ اس دور میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کو منوانے کی فکر میں تھے۔ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے ' ترقی پسند تحریک نے بھی اپنے حلقوں میں اقبال کے نظریات کے سبب ان کی مخالفت جاری رکھی سو میرے خیال میں یہ سب اسباب ایسے تھے جن کی بنا پر اقبال نے اس تحریک کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ہماری تاریخ نے جو عجیب و غریب حقیقت واضح کر رکھی ہے کہ تاریخی طور پر گو ترقی پسندی کی تحریک اقبال کے بعد وجود میں آئی اور اسے ماڈرن سمجھا گیا لیکن برصغیر ہندو پاکستان اور دنیائے اسلام میں اقبال کے نظریات آج زیادہ ماڈرن ہونے کے سبب ان ممالک کے مسلمانوں کے لئے زیادہ حسب حال ہیں یعنی ترقی پسندی کی تحریک کو وجودی شاعری کی تحریک کی طرح ہم نے داستان ماضی کی مانند پیچھے چھوڑ دیا کہ آج کی زندگی سے ان افکار کا زیادہ تعلق ہے جو حیات کے لئے تگ و دو اور تشخص منوانے کے لئے ہماری کشمکش کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔

س پنجابی یا کشمیری شاعری کے بارے میں اقبال کی کیا رائے تھی؟

ج علامہ اقبال پنجابی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ بالخصوص اس پنجابی شاعری کے جو اپنے اندر الہیاتی عنصر رکھتی ہے مثلاً بلھے شاہ کی کافیاں وارث شاہ کی ہیر اور خواجہ فرید کی کافیاں اقبال اس قسم کی شاعری کی عظمت کے بڑے معترف تھے۔ جہاں تک کشمیری شاعری کا تعلق ہے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کشمیری زبان نہ جانتے تھے گو کشمیری الاصل تھے لیکن جب ہم کشمیری شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مقصود صرف کشمیری زبان میں شاعری ہی نہیں بلکہ اس زمرے میں وہ کشمیری شعرا آتے ہیں جنہوں نے زیادہ تر فارسی زبان کو اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یہ لٹریچر بہت وسیع ہے اور اس ضمن میں محمد علی راشدی نے کشمیر کے فارسی شعرا کے متعلق کئی جلدوں میں ان کے کلام کے حصوں کے مجموعے جمع کر کے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

میرے لئے یہ کہہ سکنا تو مشکل ہے کہ اقبال نے فارسی زبان کے کن کشمیری شعرا کو اہمیت دی مگر غنی کاشمیری کے کلام سے انہیں خاص شغف حاصل تھا اس کا سبب یہ ہے کہ غنی کاشمیری کے ہاں انہیں اپنے فلسفہ خودی کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں مثلاً غنی کاشمیری کی زندگی

کے اس معمول کا ذکر کیا ہے جب وہ گھر کے اندر موجود ہوتے تھے تو دروازے مقفل کر لیا کرتے تھے لیکن جب گھر سے باہر جاتے تھے تو سب دروازے کھلے چھوڑ جاتے تھے۔ جب کسی نے ان سے پوچھا ' اس کی کیا وجہ ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ دروازے اس لئے مقفل کرتا ہوں کہ اس مکان میں سب سے قیمتی شے تو میں ہی ہوں۔ جب میں گھر میں موجود نہ ہوں تو پھر گھر میں کیا رکھا ہے۔ چونکہ یہ معمول اقبال کے فلسفہ خودی کی تائید تھا اس لئے اقبال کے ہاں غنی کاشمیری کا ذکر ملتا ہے۔

س کیا علامہ نے شاعری کے علاوہ داستان ' افسانہ ناول یا ڈرامے پر کبھی گفتگو کی یا کبھی ایسا بھی ہوا ہو کہ شاعری کے علاوہ ان کا ارادہ ان نثری اصناف کی طرف بھی ہوا ہو؟

ج اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اپنے ابتدائی زمانے میں وہ ملٹن کی فردوس گم گشتہ کی طرز پر سانحہ کربلا کو ڈرامائی انداز میں نظم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اقبال نے ڈرامہ نگاری ' افسانہ نگاری یا ناول نویسی کی اصناف کی طرف توجہ نہ دی۔ فلسفے کی طرف رجحان کے سبب شاید انہیں ان اصناف کی طرف توجہ دینے کا وقت نہ ملا لیکن انہوں نے اپنے شاعرانہ کلام میں ڈرامائی انداز یقیناً اپنایا ہے۔ اس انداز میں بعض صورتوں میں کردار کشی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ رنگ انہوں نے بعض انگریزی شاعر براؤننگ یا جرمن شاعر گوئٹے کی ان نظموں سے اخذ کیا ہو جن کا انداز ڈرامائی ہے۔ مثلاً گوئٹے کی تصنیف "فاؤسٹ" ڈرامائی انداز میں ایک نظم ہے لیکن گوئٹے ڈرامہ نگار نہ تھا اسی طرح براؤننگ کی کئی نظمیں بھی ڈرامائی انداز میں ہیں۔

لیکن براؤننگ کا شمار بھی ڈرامہ نگاروں میں نہیں ہوتا اقبال کی کئی نظموں کا انداز ڈرامائی ہے جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی مثلاً خضر راہ ' لینن خدا کے حضور میں ' مسولینی ابلیس کی مجلس شوریٰ وغیرہ۔ بہرحال ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے افکار کے اظہار کے لئے شاعری کو بطور ایک ذریعے کے اختیار کیا اور جہاں کہیں بھی ان خیالات کے اظہار کی خاطر ڈرامائی انداز اختیار کرنے کی ضرورت پڑی تو اسے بھی اپنا لیا گیا۔ سو شاعری یا ڈرامائی انداز خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی رہے۔ حقیقت میں اقبال نہ تو ڈرامہ نگار تھے نہ افسانہ نگار اور نہ ناول نویس بلکہ وہ تو اپنے آپ کو شاعر بھی سمجھنے سے گریزاں تھے۔

س علامہ اقبال وہ خوش نصیب ہیں جن پر ان کی زندگی ہی میں مضامین بلکہ کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ ان کی اس بارے میں کیا رائے تھی۔ نیز کیا کبھی اردو تنقید کے حوالے سے کوئی گفتگو آپ کو یاد ہو؟

ج یہ حقیقت ہے کہ جتنا اقبال پر لکھا گیا اس قدر برصغیر کے کسی بھی شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کی اپنی زندگی میں ان پر بہت سی کتب تحریر کی گئیں اور فارسی کلام کے کچھ حصے کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ ان کی وفات کے بعد تو اردو ادب کا بیشتر حصہ فکر اقبال کے تبصرے پر ہی مشتمل ہے اور یہ سلسلہ آج تک بڑی شدومد سے جاری و ساری ہے۔ اقبال نے اپنی فکریہ حیات پر تحریر کردہ کتب جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اردو یا فارسی زبان میں ایسی کتب زیادہ تر تعریفی نوعیت کی تھیں۔ ان کی شعری تخلیقات کے سیاسی پہلو پر بعض ہندو تبصرہ نگاروں نے ان کی زندگی میں تحریر کیا۔ اقبال نے ان کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔ شاید وہ ایسی بحثوں میں الجھنا نہ چاہتے تھے البتہ ایک تبصرے پر انہوں نے بڑے زور سے اپنے خیالات کا اظہار کر رکھا ہے۔ یہ واقعہ تب پیش آیا جب نکلسن نے ان کی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے پر بعض انگریز نقادوں نے تبصرے کئے۔ ان میں ایک تبصرہ تو انگریزی کے معروف شاعر اور نقاد ہربرٹ ریڈ کا تھا جس نے یہ کہا کہ اقبال نے اپنے ان اشعار کے ذریعے ایک مردہ قوم میں از سرنوجان ڈال دی ہے اور مغربی دنیا کو تلقین کی کہ مستقبل میں فکر اقبال کی ترویج پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ مشرقی دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہربرٹ ریڈ کے تبصرے پر تو اقبال نے کوئی بات نہ کی البتہ ایک تبصرہ نگار ڈکلسن نے اسرار خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ اقبال فاشسٹ خیالات رکھتا ہے' یہ نطشے کا پیروکار ہے اور اپنی مسلم قوم کو بیدار کر کے انہیں پھر غیر مسلم دنیا کے خلاف جہاد کی ترغیب دے رہا ہے۔ اس تبصرہ نگار کے خیالات پر اقبال نے اپنے فکر کی مدافعت میں ایک نہایت اہم مضمون تحریر کر رکھا ہے جو انہوں نے ایک طویل خط کی صورت اپنے مترجم نکلسن کو تحریر کیا اور وہ انگریزی لٹریری جرنل میں شائع ہوا۔

س ہمیں معلوم ہے کہ تصوف کے حوالے سے علامہ کے حافظ کے بارے میں نظریات عموماً

لوگوں کو پسند نہیں تھے ان میں خواص بھی تھے مثلاً خواجہ حسن نظامی ---- نظریات سے قطع نظر کیا اقبال حافظ کی شاعری کی اثر آفرینی کے بھی منکر تھے؟

ج ایسی بات قطعاً" نہ تھی بلکہ اقبال نے بار بار اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی تھی وہ حافظ کی شاعرانہ عظمت کے یقیناً قائل تھے بلکہ عطیہ فیضی کے بقول انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں لندن میں فرمایا کہ جب میں حافظ کو پڑھتا ہوں تو اس کی روح میرے اندر حلول کر جاتی ہے اور میں اپنے کلام میں بھی اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہوں۔ بعد میں جب خواجہ حسن نظامی سے اسی مسئلے پر ان کا اختلاف ہوا تو انہوں نے بار بار یہی کہا کہ مجھے حافظ کی عظمت کا مخالف نہ سمجھا جائے بلکہ میں ان کے انداز فکر کے صرف اس پہلو کا مخالف ہوں جو قاری پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں مجھ سے پیشتر بھی حافظ کے کئی تبصرہ نگاروں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کر رکھا ہے۔ بہرحال آپ کو شاید معلوم ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور اکبرالہ آبادی کے علاوہ اس معاملے میں علامہ کے اپنے والد نے بھی ان کی مخالفت کی۔ جب یہ علمی بحث جاری تھی کہ اقبال چھٹیوں میں سیالکوٹ گئے۔ والد نے کہا جب صوفیا کرام حافظ پر تمہارے تبصرے سے نالاں ہیں تو تم ان کی دل آزاری کا باعث کیوں بنتے ہو۔ اقبال نے جواب دیا کہ حافظ پرستی بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے۔ ان کے والد نے کہا۔ قرآن مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے بتوں کو بھی برا کہنے سے منع کیا ہے۔ اگر آپ کے یہ اشعار کسی حلقے کی دل آزاری کا باعث ہیں تو انہیں نکال دو۔ اقبال چپ ہو گئے اور اپنے والد کے فرمان کے مطابق اسرار خودی کے اگلے ایڈیشن میں ان اشعار کو حذف کر دیا۔

س فارسی ادب میں سعدی بہت اہم ہیں مگر اقبال نے قطعی نظرانداز کئے رکھا' ایسا کیوں تھا؟

ج اقبال کی خاموشی سے یہ اخذ کرنا حق بجانب نہیں کہ جس شاعر کا وہ ذکر نہ کریں اسے انہوں نے اس قابل نہ سمجھا فارسی لٹریچر بہت وسیع و عریض ہے۔ ہمیں اقبال کے ہاں خصوصی طور پر ان فارسی شعرا کا ذکر ملتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ان کے افکار کی تائید کرتے ہوں لیکن جن کا ذکر نہیں ملتا اس سے مراد یہ نہیں لینا چاہئے کہ اقبال ان کی عظمت کے منکر تھے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ ضروری نہیں اقبال ہر فارسی شاعر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں ----

جن فارسی شعرا کے کلام میں اقبال نے اپنے نظریات کا سراغ پایا ان کا ذکر تو وہ کسی نہ کسی انداز میں ضرور کرتے ہیں۔

س اقبال کی دربار رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں حاضری سے محروم رہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جبکہ حضورؐ سے ان کا عشق مسلمہ ہے اور وسائل بھی حاصل ہو سکتے تھے۔ جب بیت المقدس تشریف لے جا سکتے تھے تو مدینہ منورہ کیوں نہیں۔

ج آپ کے اس سوال کے جواب میں مجھے آغا شورش کاشمیری کا قول یاد آگیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "عشاق کو روضہ رسولؐ پر نہیں بلایا جاتا" یہ درست ہے کہ علامہ اقبال گول میز کانفرنس سے فراغت کے بعد مصر سے ہوتے ہوئے بیت المقدس پہنچے جہاں انہوں نے موتمر اسلامی کی کانفرنس میں شرکت کی لیکن وہ زمانہ آج کے زمانے کی طرح نہیں تھا کہ انگلینڈ یا امریکہ سے ہوائی جہاز پر واپسی پر جدہ رک گئے اور عمرہ ادا کر لیا۔ جس طرح آج کل بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ موتمر اسلامی کی کانفرنس کے انجام تک اقبال بیت المقدس میں بھی نہ رہ سکے کیونکہ ان کے جہازی سفر کے پروگرام کے مطابق انہوں نے ایک مخصوص تاریخ تک بمبئی پہنچنا تھا ۔۔۔ اس سفر کے دوران شاید روضہ رسولؐ تک پہنچ سکنا ان کے لئے ممکن نہ تھا مگر زندگی کے آخری ایام میں ان کی بڑی خواہش تھی کہ روضہ رسولؐ کا دیدار انہیں نصیب ہو۔

ان کی آخری تصنیف جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس کا نام ارمغان حجاز تجویز ہوا یعنی حجاز کا تحفہ دراصل اس کتاب میں ان کے تاثرات شامل ہونا تھے جو ان کے زیارت بیت اللہ اور روضہ رسولؐ کے بارے میں ہوتے۔ اپنی بیماری کے سبب وہ اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے یہاں تک کہ آنکھوں میں موتیا اتر آیا اور بینائی کمزور ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں آنکھیں اس قابل ہو جائیں گی کہ آپریشن کیا جا سکے۔ ان کی ایک بہن نے انہیں تسلی دینے کی خاطر کہا کہ آپریشن ہونے کے بعد آپ روضہ رسولؐ کی زیارت کرنے جا سکیں گے۔

معین قریشی سے بے نظیر بھٹو تک

اب ہم اس مرحلے پر آتے ہیں کہ بے نظیر کی حکومت کا خاتمہ کس طرح ہوا۔ پیپلزپارٹی کی حکومت کو اپنی ٹرم پوری کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

میں نے آپ کے سامنے یہ حقیقت بیان کر دی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ہمارے تجربے کے مطابق جمہوری نظام سے مراد ایک طرح کی خانہ جنگی ہے۔ سو ظاہر ہے حزب اختلاف جو بے نظیر کی حکومت کے زمانے میں نفرت و حقارت کا مرکز بنی انہوں نے اس اقتدار کی کشمکش میں کسی نہ کسی طریقے سے بے نظیر کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ اپوزیشن کی صدر پاکستان غلام اسحاق خان کے ساتھ سازباز کامیاب رہی۔

اخباری خبروں کے مطابق اس ضمن میں اس وقت کے جی او اے سی جنرل مرزا اسلم بیگ نے ان کا ساتھ دیا اور غلام اسحاق خان نے آئین کے آرٹیکل بی 2۔58 کے صوابدیدی اختیارات کے تحت بے نظیر کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پیپلزپارٹی روتی پیٹتی سپریم کورٹ میں گئی لیکن سپریم کورٹ نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے جس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے دستور میں صدر کا صوابدیدی اختیار ہے جو جنرل ضیاء الحق نے اپنی خاطر آرٹیکل 58 کے ذریعے حاصل کر رکھا تھا لیکن ان کی فوری موت کے بعد یہ اختیار بعد کے آنے والے صدر کی جھولی میں آگرا اور اس نے پنجابی مثل

"اجڑے باگاں دے گالڑ پٹواری"

کے مصداق اسے بے نظیر کی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے بے دریغ اور بلا جھجک استعمال کیا۔ ظاہر ہے جب آرٹیکل 58 کے تحت اسمبلی کا خاتمہ کیا جاتا ہے تو مرکز اور صوبوں

میں نگران حکومتیں بنتی ہیں۔ غلام اسحاق خان نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیراعظم بنایا اور
ملک میں انتخابات ہوئے۔ نئے انتخابات میں پی پی پی کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور آئی
جے آئی نے میدان مار لیا۔ نتیجے کے طور پر میز الٹ گئے۔ میاں نواز شریف وزیراعظم بنے۔
آئی جے آئی کی حکومت قائم ہوئی اور بے نظیر حزب مخالف کے لیڈر کے طور پر اسمبلی میں
بیٹھیں۔ پیپلز پارٹی نے بار بار اس الزام کو دہرایا کہ نئی منتخب شدہ اسمبلی بوگس ہے' مطلب یہ کہ
جتوئی کی نگران حکومت نے صدر' نواز شریف اور فوج سے سازباز کر کے انتخابات میں دھاندلی
کروائی ہے۔ ان الزامات کے باوجود وہ اسی بوگس اسمبلی میں ممبر کے طور پر بیٹھی بھی رہیں۔
بے نظیر کے دور حکومت میں ان کے اور ان کے وزراء بمعہ ان کے شوہر آصف زرداری کے
خلاف کئی مقدمے صدر غلام اسحاق خان نے کھڑے کئے' جو اب تک چل رہے ہیں مگر قوم کے
کروڑوں روپے برباد کرنے کے بعد اب تک بھی ان کے خلاف کوئی مقدمہ بھی کامیاب نہیں
ہو سکا۔ نواز شریف نے اپنی حکومت کے دوران اسلامی نظام کی شکل میں اس منافقانہ سلسلے کو
جاری رکھا جس کی ابتداء جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو لازوال رکھنے کی خاطر کر رکھی تھی۔
اس عہد میں اسلام کے نام پر ایسی قانون سازی کی گئی جو کہ ہر اعتبار سے منفی تھی اور جس سے
اقلیتی فرقوں کے حقوق پامال ہوئے۔ میں نے اس دور میں اس منافقت کا پردہ چاک کرنے کی
خاطر بہت کچھ لکھا۔

یہاں تک کہ وہ مذہبی پیشواء (میں ان کو عالم نہیں کہوں گا کیونکہ علماء کرام اقتدار کے
پیچھے کبھی نہیں بھاگتے بلکہ اقتدار سے نفرت کرتے ہیں اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے
ہیں) جو میاں نواز شریف کے ساتھ تھے مجھ سے بدظن ہو گئے اور مجھے مرتد کافر کے خطابات
سے نوازا۔ یہ وہ خطابات ہیں جو ہمارے مذہبی پیشواء حضرت علامہ اقبال اور قائداعظم کو بھی
عطا فرما چکے ہیں۔

سو میں چیختا چلاتا رہا کہ خدا کے واسطے اسلام کو سیاسی طور پر استعمال کرنا بند کیا جائے
لیکن میری آواز نگار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ اسلامی قانون سازی کے سلسلے میں
بعض ایسے فیصلے بھی صادر ہوئے جن کا تعلق ملکی معیشت کے نظام کو تبدیل کرنا تھا یہ ربوٰی یا

سود کے متعلق فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ تھا۔ نواز شریف کی حکومت پر پہلے تو مذہبی عناصر
نے یہ دباؤ ڈالا کہ اس فیصلے کے خلاف اپیل نہ کی جائے لیکن بعد میں حکومت نے مکمل خاموشی
سے سپریم کورٹ میں اس فیصلے کو چیلنج کر دیا۔ ابھی تک اس مسئلے کا حل دریافت نہیں ہو سکا۔

اب آیئے اس مسئلے کی طرف کہ ملک سے غربت اور بیروزگاری کو دور کرنے کی خاطر
معیشت کے میدان میں نواز شریف حکومت نے کیا کیا۔ اس ضمن میں ان کی لبرلائزیشن اور
پرائیوٹائزیشن کی پالیسیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بے نظیر کا یہ دعویٰ ہے کہ اس قسم کی پالیسیوں کی
ابتداء ان کی حکومت نے کی تھی جس کے مثبت نتائج اس لئے نہ نکل سکے کہ ان کی حکومت کو
اپنی ٹرم پوری کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ بہرحال نواز حکومت بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ
ان کی اقتصادی پالیسیوں کے مثبت نتائج کے حصول سے بیشتر ان کی حکومت کا بھی خاتمہ اسی
طرح کر دیا گیا جس طرح بے نظیر کی حکومت کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے بیروزگاری کو دور
کرنے کی خاطر یلو کیب سکیم چلائی پھر وہ قومی موٹروے بنانے کے پروگرام کو وجود میں لائے مگر
یہ سب سکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ غلام اسحاق خان سے نواز شریف کے اختلافات پیدا
ہوئے۔ بے نظیر نے غلام اسحاق خان سے سازباز کی اور نواز شریف حکومت کو بھی اپنی ٹرم
پوری کرنے سے بیشتر آرٹیکل 58 کی تلوار سے غلام اسحاق خان نے قتل کر دیا۔ اس مرتبہ
سپریم کورٹ نے غلام اسحاق خان کے فیصلے کی تائید نہیں کی بلکہ اسے غیر قانونی قرار دیتے ہوئے
اسمبلی کو اور نواز شریف حکومت کو دوبارہ بحال کر دیا۔

میں نواز شریف یا آئی جے آئی حکومت پر شدید تنقید کرتا رہا ہوں۔ اس تنقید کا ایک
پہلو یہ تھا کہ میں آئین کے آرٹیکل 58 کو اس ملک میں جمہوریت کے فروغ کی راہ میں سب
سے بڑی رکاوٹ سمجھتا رہا ہوں اور اس ضمن میں غلام اسحاق خان اور نواز شریف کے درمیان
کسی قسم کی مفاہمت کے خلاف تھا۔ ایک پیدائشی مسلم لیگی کی حیثیت سے میں نے ہر اس
نظریے اور تصور کی مخالفت کی ہے جو قائداعظم اور علامہ اقبال کے تصور اسلام اور جمہوریت
سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اسی پس منظر میں نواز شریف' غلام اسحاق خان مفاہمت پر میرا شدید
اعتراض تھا لیکن جب نواز شریف نے غلام اسحاق خان کے ساتھ یہ رشتہ توڑ کر آرٹیکل 58

کے خلاف آواز بلند کی تو میں نے نہ صرف ان کے ہاتھ مضبوط کئے بلکہ بھرپور طور پر ساتھ بھی دیا۔

میاں نواز شریف کے حق میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر دو نقطہ ہائے نگاہ ہیں ایک یہ ہے کہ جب پہلے سپریم کورٹ اسی شق کے بارے میں مختلف فیصلہ کر چکا تھا (بے نظیر کے کیس میں) تو اب نواز شریف کے مقدمے میں کس بنا پر دوسرا فیصلہ کیا۔ دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ دس کے مقابلے میں ایک جج جس نے اختلافی نوٹ دیا' بالکل درست تھا۔ اس مسئلے پر میں دوسرے نقطہ نگاہ کا حامی ہوں' کیونکہ میرے خیال میں سپریم کورٹ نے اس فیصلہ کے ذریعے اپنی تاریخی روایت سے قطعی طور پر ہٹ کر ایک نیا رستہ قائم کیا ہے جو اس مرحلے پر جمہوریت کی بقا اور تحفظ کے لئے اشد ضروری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں سیاسی تعطل کے بجائے کسی نہ کسی صورت میں انتظامی تسلسل قائم رکھنے کی خاطر سپریم کورٹ نے یہ رول ادا کیا کہ مارشل لاء کی حکومتوں کو نظریہ ضرورت کے تحت قانونی حیثیت دی جاتی رہی۔ حالانکہ اس کے اس استدلال کے سبب جسٹس محمد منیر کے زمانے سے لے کر اب تک سپریم کورٹ کے اس قسم کے فیصلوں پر تنقید ہی ہوتی رہی ہے۔ سب سے بڑا اعتراض جو ان گذشتہ فیصلوں پر کیا گیا وہ یہ تھا کہ جمہوری آئین کے تحت قانون کی بالادستی ایک بنیادی اصول ہے مگر ہمارے سپریم کورٹ نے مارشل لائی حکومتوں کو قانونی حیثیت بخش کر اس اصول کا تحفظ نہیں کیا۔ گویا سپریم کورٹ نے ہمیشہ کسی (Dynamic) متحرک فیصلے دینے کے بجائے اس میدان میں ایسے فیصلے کئے جو عمل کے اعتبار سے ساکت تھے اور جمہوریت کی روح کے منافی تھے۔ یہاں تک کہ جونیجو کیس میں جب یہ فیصلہ بھی دے دیا گیا کہ ان کی حکومت اور پارلیمنٹ کو غیر قانونی طور پر ختم کیا گیا ہے تو تب بھی ان کی حکومت اور اسمبلی کو بحال نہ کیا گیا۔ بعدازاں جب بے نظیر کے کیس میں صدر کے صوابدیدی اختیارات کے استعمال کو درست قرار دیا گیا تو یہ بات بھی اسی حقیقت کی غماز تھی کہ سپریم کورٹ ابھی تک اپنی روایت ہی برقرار رکھے ہے اور اس ضمن میں کوئی انقلابی فیصلہ دینے کا اہل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ نے حالیہ فیصلہ دے کر جو نیا رستہ تلاش کیا ہے وہ اس ملک میں جمہوری نظام کے استحکام کے لئے ضروری

تھا۔ کسی نہ کسی مرحلے پر سپریم کورٹ کی طرف سے ایسا فیصلہ دینے کی اشد ضرورت تھی۔ یہ درست ہے کہ ایسا فیصلہ بے نظیر کے کیس میں بھی دیا جا سکتا تھا لیکن اگر اب دیا گیا ہے تو یہ محض اتفاق ہے کہ اس کا فائدہ بے نظیر کی بجائے کسی اور کو پہنچا تھا میری نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وزیراعظم کون ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ جب تک آرٹیکل 58 آئین میں موجود ہے ایک ایسا شخص جو کسی کو جوابدہ نہیں اپنے عمل سے ایک ایسے وزیراعظم کی حکومت اور اسمبلی کو ختم کر سکتا ہے جس کے پاس اکثریت یا عوام کا مینڈیٹ ہے۔

اور جو قوم کو جوابدہ ہے۔ لہٰذا اس غیر جمہوری اختیار کو مقید یا محدود کر کے رکھنا سپریم کورٹ کا فرض ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات نہایت افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ پی پی پی نے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے خلاف جو زہر اگلا اور جو ان پر کیچڑ اچھالا گیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی ادارہ قابل اعتماد نہیں اور جب کسی قوم کی یہ صورت ہو جائے تو یہ اس کے انتہائی انتشار کی علامت ہے۔

خیر یہ تو ایک الگ بحث تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہمارے سیاست دانوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ انہیں آئین یا جمہوریت کی کوئی قدر نہیں۔ اقتدار کی جنگ میں کسی اصول کی پرواہ نہیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ (سپریم کورٹ نے چاہے اسے غلط سمجھیں یا صحیح) ایک فیصلہ دے کر نواز شریف کی حکومت اور اسمبلی کو بحال کر دیا اور صدر کے صوابدیدی اختیارات کے استعمال کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

بعد ازاں نواز شریف نے اس بحال شدہ اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ یہ دونوں چیزیں جمہوریت کے بنیادی اصول ہیں یعنی قانون کی بالادستی کو برقرار رکھنا اور اعتماد کے ووٹ کی تعظیم کرنا۔ مگر یہاں کیا ہوا' اپوزیشن کی صدر کے ساتھ سازش جاری رہی۔ صدر نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے صوبوں کو وفاق کے خلاف اکسایا اور اس کے پس منظر میں سوائے ضد کے اور یہ ثابت کرنے کے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ غلط ہے اور کوئی وجہ نہ تھی۔

پنجاب میں بھی حکومت سازشی انداز میں تبدیل کی گئی۔ پانچ ہزار بسیں بے نظیر کی لانگ مارچ کے لئے حکومتی خرچ پر حاصل کی گئیں اس لانگ مارچ کے ذریعے اسلام آباد فتح کرنا مقصود تھا لیکن کوئی بھی ادارہ فیڈرل حکومت کے تحفظ کے لئے آگے نہ بڑھا "نتیجتاً" نواز شریف کو اپنی حکومت اور اسمبلی کو خود ہی ختم کرنا پڑا۔

جاتے جاتے نواز شریف غلام اسحاق خان کو بھی لے ڈوبے۔ ہمارے ملک کی یہ بھی ایک مسلمہ روایت ہے کہ ہر صدر ہمیشہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے منصب سے سبکدوش ہوتا ہے یا اس قسم کی موت مرتا ہے جو جنرل ضیاء الحق کے نصیب میں آئی۔

ملک غلام محمد اور سکندر مرزا ذلیل و خوار ہو کر نکلے اور لوگوں کو یہ بھی علم نہیں کہ ان کی قبریں کہاں ہیں۔ جنرل ایوب خاں اور یحییٰ خاں اپنے گھر میں سب کو گالیاں دیتے ہوئے مر گئے۔

بدعنوانی کے الزامات غلام اسحاق خان نے جس طرح بے نظیر حکومت پر لگائے تھے۔ ان

کے مقدمے اب تک چل رہے ہیں جن پر قومی خزانے کے پیسے پانی کی طرح بہائے گئے اور ٹیکس ادا کرنے والوں نے یہ اخراجات برداشت کئے۔ ان مقدموں میں اب تک کوئی بھی کامیاب نہ ہوا۔ اسی طرح نواز شریف حکومت پر بھی نااہلی' غبن اور بدعنوانی کے مقدمات چلائے جانے کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں مگر کیا ان مقدموں سے کوئی مثبت بات نکلے گی یا نہیں یہ کہنا پیش از وقت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاسی احتساب کا کوئی واضح طریق کار نہیں۔ حریف ایک دوسرے پر غداری' بے ایمانی اور بددیانتی کی تہمتیں لگاتے رہتے ہیں لیکن جب ایسے معاملے عدالتوں کے سامنے آتے ہیں تو کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کیا جاتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ جو کچھ کیا گیا ہے صریحاً بدنیتی سے کیا گیا ہے۔ کردار کشی کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس ملک میں شریف لوگ ووٹ ڈالنے سے گریز کرتے ہیں اور منہ چھپا کر اپنے گھر میں بیٹھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ انہیں وہاں بھی سکون نصیب نہیں ہوتا کیونکہ مہنگائی بڑھتی جاتی ہے۔ بجلی' گیس اور پانی ایسی بنیادی ضروریات کے نرخ بھی بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ عام آدمی کے لئے جینا دوبھر ہوتا جاتا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کی کوئی بھی حکومت فوری طور پر تمام مسائل حل کرنے کی اہل نہیں۔ ان مسائل کے حلے کے لئے ایک حکومت نہیں بلکہ کئی حکومتیں درکار ہیں بشرطیکہ وہ دیانتداری سے ان کے حل کی طرف توجہ کریں اور ملک کو ذاتی سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے محض اکھاڑہ نہ سمجھیں۔ قوم اس قسم کی پہلوانی سے بہت تنگ آ چکی ہے۔

1993ء میں پاکستان ایک بار پھر انتخابات کی گہما گہمی سے گزرا ہے جس کے نتائج بعض اعتبار سے حوصلہ افزا اور بعض اعتبار سے حوصلہ شکن ہیں۔ مثلاً ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کو اور بالخصوص ان مذہبی پیشواء حضرات کو جو اقتدار کے حصول کے لئے بے تاب تھے' شکست فاش ہوئی ہے یعنی ملک میں طاقت کے اصل سرچشمے (عوام) نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ مذہبی پیشواؤں اور بنیاد پرستوں کو ایسی شکست فاش اس سے بیشتر قائداعظمؒ کے زمانے ہی میں ہوئی تھی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان دو جماعتی سسٹم کے اصول کو اپنا رہا ہے کیونکہ ان انتخابات میں صرف دو بڑی جماعتوں پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) کے حق میں عوام نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور باقی منتشر چھوٹی چھوٹی سیاسی جماعتوں کا یا تو صفایا کر دیا

گیا ہے یا انہیں اقتدار میں تھوڑا حصہ ملا ہے۔ یہ اچھی بات ہے بشرطیکہ ہماری سیاست میں رواداری اور اعتماد کی فضا بھی پیدا کی جائے مستقبل میں جمہوریت کے فروغ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ایک اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ طاقت کے سرچشمہ نے منقسم مینڈیٹ کا فتویٰ دے کر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہم بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو پسند کرتے ہیں لیکن عوام نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی اتنی اکثریت نہیں دی کہ ان میں سے ایک اپنی حکومت بنا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ معلق ہے اور پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد ممبران پارلیمنٹ یا اقلیتی ممبران کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ یہ عنصر گھڑیال کے پنڈولم کی طرح کسی طرف بھی لڑھک سکتا ہے۔ فی الحال وہ پی پی پی کے ساتھ گیا ہے لہذا بے نظیر بھٹو صاحبہ مرکز اور پنجاب میں اسی لڑھکتے ہوئے عنصر کے سہارے حکومت بنانے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔ صرف ایک صوبہ سندھ ہے جس کے عوام نے برملا اپنی رائے کا اظہار پی پی پی کے حق میں کیا ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی لڑھکتے ہوئے عنصر کی حمایت کے ساتھ مسلم لیگ (ن) حکومتیں بنانے میں کامیاب ہو سکی ہے۔ لڑھکتے ہوئے عنصر کے سہارے مرکزی یا صوبائی حکومتیں بنانا اور ان کو چلانا نہایت مشکل کام ہے کیونکہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس ریت کے ٹیلے کو ہوا اٹھا کر کس جانب لے جائے۔ یہ نتیجہ کم از کم جمہوریت کے فروغ کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ حکومت کو بعض اہم معاملات پر قانون سازی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لڑھکتا ہوا عنصر صرف محبت یا پیار کے سبب اس کی یا اُس کی انگلی نہیں پکڑتا بلکہ معاوضہ اور قیمت مانگتا ہے۔ علاوہ اس کے اس کی بھوک تھوڑی سی غذا سے دور نہیں ہوتی بلکہ اس کا منہ چڑیا کے بوٹ کی طرح ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور اس کے منہ میں جو غذا ڈالے وہ اس کی انگلی پکڑ لیتا ہے۔ اگر پاکستان میں بڑی پارٹیوں کا ایک دوسرے پر اعتماد قائم نہ ہوا یا رواداری کی فضا پیدا نہ ہوئی تو کوئی عجب نہیں کہ حکومت وقت کو چھ ماہ کے اندر ہاؤس سے اعتماد کا ووٹ لینا پڑے یا ایک برس کے عرصہ میں ملک کو ایک مرتبہ پھر انتخابات کی آزمائش سے گذرنا پڑے۔

یہ نتیجہ نہایت حوصلہ شکن ہے کیونکہ اس نتیجے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ آرٹیکل 58 جوں کا توں آئین میں موجود ہے یعنی صدر کے صوابدیدی اختیارات جس کے تحت وہ پاپولر اسمبلی کو ختم کر سکتا ہے، قائم و دوائم ہے۔

آپ سب نے دیکھا کہ اس ملک میں سپریم کورٹ میں فیصلے کے باوجود یا پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لینے کے باوجود نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی۔ یہ حکومت کیسے ختم ہوئی یا کس نے ختم کی یہ بحث بیکار ہے۔ آئین کے تحت قائم مقام صدر نے نگران وزیراعظم مقرر کیا۔ اسٹبلشمنٹ کا اتفاق رائے معین قریشی کے حق میں ہوا کہ انہیں نگران وزیراعظم بنایا جائے۔ ان صاحب کو باہر سے ملک میں لا کر وزیراعظم کا تاج پہنایا گیا، اسی طرح جیسے پاکستان میں کمزور سیاسی حکومتوں کے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ محمد علی بوگرہ کو باہر سے بلوا کر وزیراعظم بنایا گیا تھا۔ بہرحال معین قریشی نگران وزیراعظم بنے اور انہوں نے اسٹبلشمنٹ کی ایما سے اپنی نگران کابینہ بھی ترتیب دی۔ صوبوں میں بھی نگران حکومتیں قائم ہوئیں اور شفاف انتخابات کا وعدہ کیا گیا۔ تین ماہ کی مدت میں روپے کی قیمت گرائی گئی۔ بنکوں سے قرضے لے کر نہ دینے والوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون کے بلوں کی ادائیگی نہ کرنے والوں کے خلاف بھی قدم اٹھائے گئے۔ یہ اصلاحات نگران وزیراعظم اس لئے کرنے میں کامیاب ہوئے کہ ان کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہ تھا اور وہ کسی کو جوابدہ نہ تھے۔ اشیاء کی قیمتیں اور چڑھ گئیں۔ غریب کے لئے جو پہلے زندگی عذاب تھی تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ معین قریشی بار بار یہ اصرار کرتے رہے کہ مجھ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں اور میں قطعی غیر جانبدار ہوں لیکن ان کی غیر جانبداری کے بارے میں اخبارات اور عوام میں کئی قسم کے سوال اٹھتے رہے۔ رخصت ہوتے ہوئے وہ کچھ ایسے کام کر گئے جن کی تفصیل اب اخبارات میں شائع ہو رہی ہے اور یوں ان کی شخصیت بھی متنازعہ بن گئی ہے۔ بہرحال ان کی زیر نگرانی الیکشن کمشن نے جو شفاف انتخابات کرائے ان پر بھی بعض حلقے مطمئن نہیں۔ اس خیال کا اظہار کئی بار کیا گیا کہ ان نام نہاد شفاف انتخابات کے ذریعے معلق پارلیمنٹ وجود میں آئے گی اور ایک ایسے ٹیلر میڈ سوٹ کی طرح فٹ ہو گی جس انداز میں اسٹبلشمنٹ چاہتی ہے۔

آخر میں آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر انتخابات کا محض شفاف ہونا ہمارے بنیادی مسئلے کا حل نہیں تو پھر وہ حل کیا ہے؟ میری ناقص رائے میں ہمارے بنیادی مسئلے کا حل یہی ہے کہ آرٹیکل 58 کو یعنی صدر کے صوابدیدی اختیارات کو آئین سے خارج کر دیا جائے۔